علمی موتی

مولانا زر محمد صاحب مدظلہ

استاذ جامعہ فاروقیہ کراچی

بیت السلام

کراچی ○ پاکستان

علمی موتی

مولانا زرمحمد صاحب مدظلہ
استاذ جامعہ فاروقیہ کراچی

علماء دیوبند کے علوم کا پاسبان
دینی وعلمی کتابوں کا عظیم مرکز ٹیلیگرام چینل
حنفی کتب خانہ محمد معاذ خان
درس نظامی کیلئے ایک مفید ترین
ٹیلیگرام چینل

بیت السلام
کراچی ۰ پاکستان

قرآن وسنت اور مستند علمی کتب کی معیاری اشاعت کا مرکز

• جملہ حقوق .... بحق ناشر محفوظ ہیں

• طبع جدید .... مارچ 2014ء
• تعداد 1100
• ناشر .... بیت السلام

بیت السلام
کراچی ○ پاکستان

شان پلازہ، نزد بیت المقدس مسجد، اردو بازار، کراچی
موبائل: 0321-3817119 فون: 021-32711878

فہرست

کچھ علم اور اہلِ علم کی باتیں ---------- 11

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک ---------- 18

بالفاظِ دیگر ---------- 19

ایک دُوسرے انداز سے ---------- 20

دو غار دو سفر اور دو یار ---------- 20

نکاح میں فضولیات سے نجات کا طریقہ ---------- 24

حضرت بایزید بسطامیؒ اور ایک یہودی عالم کا مباحثہ ---------- 25

سلطنت کی قیمت ---------- 32

عربی زبان کی خصوصیات ---------- 33

اِمامِ اعظمؒ کو "ابوحنیفہ" کہنے کی وجہ ---------- 35

جمود علی الظاہر کی بدترین مثال ---------- 35

تبحرِ علمی کے باوجود لاعلمی کا اعتراف ---------- 36

کاش! مسلمان کو اللہ پر ایسا اعتماد حاصل ہو جائے ---------- 36

اہلِ علم کے لئے تازیانہ ---------- 36

خواب ہی میں ایک مشکل آیت کا حل دِل میں پڑا ---------- 37

ایفائے عہد کا ایک عجیب واقعہ ---------- 38

نفوسِ اِنسانی کی اصلاح کا سب سے اچھا طریقہ ---------- 39

فرعون پر موسیٰ علیہ السلام کا خوف و ہیبت ---------- 39

اللہ کا کوئی ہم نشین نہیں ---------- 40
آج کل عام مسلمانوں کی ایک غلطی ---------- 40
ایک عابد کا قصہ ---------- 41
اللہ کی رسّی کو تھامنے کا طریقۂ کار ---------- 42
یقین وایمان کی دولت کس طرح حاصل کی جائے؟ ---------- 42
عربی زبان کی ابتداء کب سے ہوئی؟ ---------- 43
عورت اور منصبِ افتاء ---------- 43
علم کی عزّت تبلیغ ہی میں ہے ---------- 43
شرم وحیاء کی قسمیں ---------- 44
ایک اہم تنبیہ ---------- 45
ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں ---------- 45
چیونٹی بھی عصمتِ انبیاء کی قائل ہے ---------- 46
بعض دفعہ اکابر صوفیاء کے کلام کی تاویل ضروری ہے ---------- 46
حجاج بن یوسف کو بھی ایک عورت نے شکست دے دی ---------- 47
ایک خصوصیت انبیاء کی ---------- 48
مستعمل پانی کا احترام ضروری ہے ---------- 48
کوئی شے بیکار نہیں ---------- 48
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں ---------- 48
ایک بادشاہ اور ایک مکھی ---------- 49
ایک بچھو کا عجیب واقعہ ---------- 49
علاماتِ قیامت ---------- 51
پانچ ہزار کتابوں کا نچوڑ ---------- 52
موجودہ دور میں ایک خطرناک چیز ---------- 53
صحابہؓ کی زیارت ---------- 53

حدیث کا ایک عجیب مضمون ---------- 53
کمال شیخ بوعلی سینا و کرامت ولی ---------- 59
علمِ دِین کی قدر و عظمت کا ایک واقعہ ---------- 60
علوِ سند کے لئے میر سیّد شریف کا طویل سفر، ایک دِلچسپ واقعہ ---------- 60
کلمۃ خالدۃ ---------- 61
لوہے کو لوہا کاٹتا ہے ---------- 61
لطیفہ عجیبہ ---------- 62
پاکباز عاشق ---------- 62
مکھی کے بارے میں ایک عجیب حدیث ---------- 63
شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکیمانہ توجیہات ---------- 64
مکھی کے بارے میں کچھ اضافی معلومات ---------- 65
ایک عجیب کتاب ---------- 65
بدعات سے نفرت میں حد کردی ---------- 66
عرب کی تاریخ اور ان کی رُسومات جاننے کے لئے دو کتابیں ---------- 66
وسیلے کی زیادہ تشریح کس نے کی؟ ---------- 66
شانِ اِبراہیمؑ ---------- 66
ایک ہی آیت میں تکمیلِ انسان کی چار صفات ---------- 68
اشرف ہی اشرف ---------- 69
حدیث: "اوّل من قاس ابلیس" کا صحیح مطلب ---------- 70
اِمام غزالیؒ اور اِمام رازیؒ نے فلسفے کے عمیق مطالعے کے بعد کیا نتیجہ نکالا؟ ---------- 70
خلوت کی اہمیت ---------- 71
گناہ کرنے سے پہلے سوچ لیں...! ---------- 72
قیمتی کتب خانے کو جدا کرنا گوارا نہیں کیا ---------- 74
باقاعدہ مدارس کی ابتداء کب ہوئی؟ ---------- 74

مدارس اور دُوسری ملّی خدمات کے معاوضے کی حد 75
پختہ مضبوط گھر تعمیر کرنا توکل کے خلاف نہیں 75
انسان بے نیاز ہو جائے تو ظلم کرتا ہے 76
حکم زکوٰۃ میں بنیادی بات 76
تفسیر قرآن کا سب سے بڑا مدرسہ 77
علامہ آلوسیؒ کے عجیب اَشعار 78
خازن کی وجہ تسمیہ 78
عیال انسان کی نیکیوں کے لئے گُھن ہے 79
تقلید کی حقیقت اور اس کی تفصیل کے لئے معاون کتابیں 79
دُنیا میں تو سب سے بڑے کافر کی دُعا بھی قبول ہو سکتی ہے 80
جھوٹ اور پھر چالاکی بھی 80
شیطانی منطقی استدلال اور اس کی تردید 82
اِجتہادی مسائل کو محاذِ جنگ بنانا دُرست نہیں 82
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کا ہے 83
سلام کا فرق 83
بچوں کی جماعت 84
جھوٹ کی ایک قسم 85
ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانہ جاہلیت 85
اِختلافِ اَئمہ باعثِ رحمت ہے 86
اِمام ابوحنیفہؒ کی غریب پروری 90
اِمام ابوحنیفہؒ کا تجارت میں تقویٰ 92
کثرتِ تصنیف مسلمانوں کی خصوصیت ہے 93
عمدہ لباس اور لذیذ کھانا منع نہیں 94
حق گوئی کی جرأت 96

مچھر کا خون اور اِنسان کا خون 97

گھوڑے کا چشمہ 98

طلبِ علم کی ایک صحیح اور روشن مثال 98

غیر معمولی حافظہ 100

ابن جوزیؒ کی فقہاء پر گرفت 100

مجدد الف ثانیؒ فاروقی جوش کو نہیں روک سکے 101

معاملات کی صفائی اور تنازعات 102

شیطان کا ایک بڑا دھوکا 108

ایک عجیب سوال کا عجیب جواب 108

سلف صالحین کے حالات کے مطالعے کی ضرورت 109

بعض گناہوں کی کچھ سزا دُنیا میں بھی ملتی ہے 109

ایک آیت سے آٹھ مسائلِ شرعیہ 110

کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے 111

شادی مگر سادی 112

حفاظتِ قرآن پر ایک واقعہ 117

پاکستان کو ڈاڑھی مبارک 118

قلم کی اہمیت 119

قرآن مجید کے چیلنج کا جواب قیامت تک نہیں ہوسکتا 120

نکاح کے لئے انتخاب کا معیار 120

حقیقتِ حسن 122

ایک اہم تاریخی واقعہ 123

گانے بجانے کی حرمت 127

سلطان محمودؒ کا عدل وانصاف 129

الجہاد فی الاسلام 132

عملی مشکلات کا حل 138
حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ 139
شوق پورا کرنا 141
جانوروں پر رحم 142
زبان کی حفاظت 144
اختلافِ رائے کی حدود 146
اصلاحِ حال کی ایک غلط کوشش 147
اختلافِ رائے اور جھگڑے فساد میں فرق 147
آدابِ دُعاء 148
بادشاہِ شام کے مقابلے میں جرأت واستقامت کی ایک مثال 151
اُمراءِ سلطنت کا نیلام 153
مشاہد ومزارات پر حصولِ مقصد کے افسانے 155
جہیز کیا ہوتا ہے؟ 156
جہیز یا کنیادان کی رسم 157
پرہیزگاری کے لئے دس چیزیں 158
آگ میں آگ 158
ایک عابد کا شیطان سے مقابلہ 160
شیطان کی چالیں 162
ایک عبرت ناک واقعہ 166
اقسامِ سفر 167
لطیفہ ملیحہ 171
ترجمہ قرآن کے اِمام وبانی 171
حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ 175
تخلیقِ عالم اور عیدِ الٰہی 177

عجیب واقعہ 177
قاضی ایاس کی ذہانت 179
دُور اندیشی 181
اِمامِ اعظم رحمہ اللہ کی نصیحتیں 182
سچ کی تاثیر 186
خون آمیز خط 187
اللہ تعالیٰ کو ہنسانے والے کام 190
پانچ چیزوں کی تلاش 191
انسان جانوروں سے بھی سیکھتا ہے 191
جنات کہاں دفن ہوتے ہیں؟ 192
باتیں بڑوں کی 193
ایمانی مزاج کب بیمار ہوتا ہے؟ 194
اللہ کے راستے میں تکلیف 194
نماز سے غافل کرنے والی چیزیں 194
نفع کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں؟ 195
مدینہ والوں میں سب سے بہترین آدمی 195
حضرت ابو یزید بسطامیؒ 196
انسان کیا ہے؟ 197
بچوں کی تعلیم و تربیت 198
موجودہ دور اور نجات 198
جہاد اور لڑائی میں فرق 199
مختصر جملے میں حضور ﷺ کی پوری سوانح عمری 200
بلیغ اور مؤثر تقریر 201
زبان کی آفتیں 201

حضرت حسینؓ کی عادت 202
زندگی کا اُلٹا رُخ 202
نعمت کے آثار دُوسروں کو نظر آئیں 203
عورت کی سب سے بڑی خوبی 204
رُوح کے چار مکان 205
محبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 205
اللہ کے خوف سے نکلنے والے آنسوؤں کی برکت 205
سب سے قریب راستہ 205
صحت مند رہنے کے لئے عبادت خانے جایئے 205

کچھ علم اور اہلِ علم کی باتیں

• .....بعض علماء نے کہا ہے کہ عقل بغیر علم وادب کے ایسی ہے جیسے کوئی درخت جو پھل نہ دیتا ہو اور عقل، علم وادب کے ساتھ ایسی ہے جیسے پھل اور درخت ہوتا ہے۔

• .....ابن المقفع نے کہا ہے: جس طرح ادب کامل نہیں ہوتا بغیر عقل (علم) کے، ایسے ہی عقل بغیر ادب کے کامل نہیں ہوتی۔

اس سے پتہ چلا کہ جاہل عاقل بھی زیادہ نفع بخش نہیں، ایسے ہی غافل (بے ادب) عالم بھی زیادہ نفع بخش نہیں۔

• .....بعض حکماء نے کہا ہے: جب کسی آدمی میں عقل وعلم دونوں جمع ہو جائیں تو اس کی زندگی خوشگوار گزرے گی، اور وہ بلند مرتبہ بھی حاصل کر لے گا اور دُنیا اور آخرت دونوں کو بنا لے گا۔

• .....اور یہ بھی کہا ہے کہ: علم ایسی عزّت ہے جو کبھی پُرانی نہیں ہوتی، اور ایسا خزانہ ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتا۔

• .....ابن المقفع نے کہا ہے: تم علم حاصل کرو، اگر بادشاہ ہو تو اور بلند ہو جاؤ گے، اور اگر متوسط لوگوں میں ہو تو سردار ہو جاؤ گے، اور اگر معمولی لوگوں میں ہو تو پھر چین سے رہو گے۔ (الانتخاب الجدید مطبوعہ ۱۸۸۹ء)

• .....تعلیم یافتہ انسان زمین کے لئے اسی طرح باعثِ زینت ہے جس طرح ستارے آسمان کے لئے سامانِ آرائش ہیں۔

• .....شجرِ علم کو اَشک ہائے چشم سے سیراب کرنا چاہئے۔

• .....تحصیلِ علم نوافل سے افضل ہے۔ (امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ)

- ..... جہانِ علم میں جہالت کا اندھیرا کبھی نہیں آ سکتا۔
- ..... کسی کتاب کا مطالعہ کرو تو آخیر میں کچھ نتیجے اخذ کرلو، ورنہ سرسری طور سے مطالعہ کرنا بغیر چبائے نگلنے کے مانند ہے۔
- ..... علم، محنت، مکمل مطالعہ اور تنہا نشینی سے حاصل ہوتا ہے۔
- ..... سوائے علم کے دُنیا میں تمام چیزوں کی حد ہے۔
- ..... کتابیں اس طرح سے پڑھو کہ دِل و دِماغ کو عمدہ خیالات سے معمور کرنا ہے، اس طرح سے نہیں کہ تھیلیوں کو روپیوں سے بھرنا ہے۔ (مأخوذ از ''چٹان'' لاہور)
- ..... میں اُستاذ کو باپ پر اس لئے ترجیح دیتا ہوں کہ میرے باپ نے مجھے آسمان سے زمین پر اُتارا ہے، اور میرے اُستاذ نے مجھے زمین سے آسمان پر پہنچایا ہے۔ (سکندرِ اعظم، بحوالہ تفسیر کبیر)
- ..... یہ نہ دیکھئے کہ کون کہتا ہے، یہ دیکھئے کہ کیا کہتا ہے۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ)
- ..... کئی باتوں سے آگاہ ہونا جاہلِ مطلق رہنے سے اچھا ہے۔
- ..... جو طالبِ علم ہے، وہ عالم ہے۔ جس نے یہ سمجھا کہ میں نے حاصل کرلیا وہ جاہل ہے۔
- ..... علم اور نیکی کا میدان بے حد وسیع ہے۔
- ..... میں مروں تو کتب خانے میں مروں۔ (لارڈ میکالے)
- ..... اپنے اُستاذ کی بزرگی و عظمت کا خیال نہ رکھنے والا ہمیشہ بے فیض رہتا ہے۔
- ..... اہلِ علم کی قدر ہمیشہ کی گئی ہے، اور ہمیشہ کی جاتی رہے گی۔ (''چٹان'' لاہور)
- ..... علم اللہ کی صفات میں سے ہے، عالم خدا سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

ذیل میں اہلِ علم کے کچھ واقعات لکھتے ہیں جو فکر انگیز بھی ہیں اور نتیجہ خیز بھی اور بصیرت و عبرت کے نمونے بھی۔

① ..... اِمام شافعی علیہ الرحمۃ کا بیان ہے کہ جب میں نے قرآن ختم کرلیا تو مسجد میں آتا اور وہاں علماء کے ساتھ بیٹھ کر حدیث حفظ کرتا اور مسائل ضبط کرتا تھا، میرا مکان شعب الخیف میں تھا، میں بہت غریب تھا، اتنی وسعت نہیں تھی کہ جو کچھ علماء سے سنوں اسے لکھ لوں،

لہٰذا اُونٹ کی ہڈیوں کو جمع کرتا تھا اور انہیں پر لکھ لیتا تھا۔ (الاکمال فی اسماء الرجال، ص:۴۱)

② .....ایک طالبِ علم ایک عالم کے دروازے پر کھڑا ہوا اور پکار کر کہا: اے کریم! جو کچھ آپ کو اللہ کی طرف سے ملا ہے، اس سے مجھ پر کچھ احسان کیجئے۔ عالم نے کھانا اور کچھ پیسے دینے کا حکم کیا، طالبِ علم نے شکریہ کے ساتھ انہیں لوٹا دیا اور کہا: مجھے اس کھانے اور مال سے کہیں زیادہ آپ کے علم کی احتیاج ہے (یعنی یہ طالبِ علم اس قابل تھا کہ اس کی کھانے اور مال سے مدد کی جاسکتی تھی وہ اس کا مستحق تھا، لیکن اسے علم کی پیاس تھی جو یہیں سے بجھ سکتی تھی، کھانا تو کہیں اور بھی کھالیتا۔)

طالبِ علم کے اس جواب سے عالم کے چہرے پر بشاشت آگئی اور طالبِ علم کو نہایت اعزاز واکرام سے بٹھایا اور جو کچھ اس نے پوچھا بتادیا، طالبِ علم خوش ہوکر وہاں سے یہ کہتا ہوا لوٹا: علم بہتر ہے مال سے، علم تمہاری حفاظت کرے گا اور تم کو مال کی حفاظت کرنی ہوگی، علم جتنا خرچ کرو بڑھتا ہے اور مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے۔ (السمیر المہذب مصری)

③ .....ایک مال دار تاجر بیمار ہوا، اس نے سوچا مرنے کا وقت اب قریب ہے، اپنے لڑکے کو بلا کر یہ وصیت کی کہ: اگر تم میری وارثت سے کامیاب ہونا چاہتے ہو تو کبھی اپنی تعلیم مت چھوڑنا اور علم کے ذریعہ اپنی اصلاح کرتے رہنا، کیونکہ دولت تو ختم ہوجانے والی چیز ہے، خدانخواستہ فقر وفاقہ کی نوبت آئے تو علم تمہارا ساتھ دے گا۔ پھر تاجر نے ایک شعر پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ: علم وعقل ہی انسان کو قدر ومنزلت پر پہنچا سکتے ہیں، مال ودولت سے حقیقی رِفعت ومنزلت نہیں حاصل ہوتی، بہت سے لوگوں کو علم نے بلند مرتبوں پر پہنچادیا ہے اور کتنے شریف خاندان سے تعلق رکھنے والے جاہلوں کو ان کی جہالت نے ذِلت ومسکنت سے دوچار کیا ہے۔ (المسیر المہذب، ج:۱، ص:۲۱)

④ .....ایک علمِ حساب کے طالبِ علم سے اس کے اُستاذ نے تین سوالات کئے، تیسرا سوال کچھ مشکل تھا، جسے وہ حل نہیں کرسکا تھا، اُستاذ نے چاہا کہ اسے حل کردے، لیکن لڑکے نے کہا: نہیں! آپ حل نہ کریں، مجھے دوتین روز کی مہلت دیں، میں اسے حل کروں گا۔ اُستاذ

نے کہا: جاؤ، جب حل ہو جائے دِکھا دینا۔ تین روز کے بعد لڑکے نے سوال حل کر لیا اور اُستاذ کو دِکھا دیا، جواب دُرست تھا، اس کے بعد لڑکے کا حوصلہ بلند ہوا، آپس میں بحث وتکرار کا شوق پیدا ہوا اور علمِ حساب سے اس کی دِلچسپی بڑھ گئی، اور ایک روز وہ آیا کہ وہ ماہر حساب دانوں میں شمار کیا جانے لگا۔ (السمیر المہذب)

⑤..... اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حماد رحمۃ اللہ علیہ نے جب قرآن ختم کیا تو اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حماد رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاذ کو پانچ سو دینار بطور ہدیہ کے پیش کئے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ: اس وقت میرے پاس اتنے ہی ہیں، انہیں آپ قبول کرلیں، یہ قرآن کی عظمت کے پیشِ نظر دے رہا ہوں، آپ کی اُجرت نہیں ہے اگر اس وقت میرے پاس اور ہوتے تو میں اور دیتا۔ (الانتخاب الجدید)

⑥..... جب ہارون رشید مدینہ منورہ آیا تو اسے معلوم ہوا کہ یہاں حضرت اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب (مؤطا اِمام مالک) کا لوگوں کو درس دیتے ہیں، خلیفہ کو کتاب پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، ایک شخص کو بھیجا کہ اِمام صاحب کتاب لے کر آئیں اور پڑھ کر سنائیں، قاصد سے اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جاؤ! خلیفہ سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ لوگ علم کی طرف دوڑتے ہیں، میں علم کی طرف نہیں دوڑتا۔

یہ جواب سن کر ہارون رشید خود اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ تخت پر بیٹھ کر درس دے رہے تھے، ہارون رشید بھی تخت پر بیٹھ گیا اور پڑھنا شروع کیا، تو اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: امیر المؤمنین! میں نے اپنے دیار میں اہلِ علم کو دیکھا ہے کہ علم حاصل کرنے کے لئے تواضع اختیار کرتے ہیں۔ یہ سن کر ہارون رشید تخت سے اُتر گیا اور طالب علموں کی صف میں بیٹھ کر تمام شاگردوں کی طرح کتاب پڑھنا شروع کر دیا۔ (السمیر المہذب)

⑦..... اِمام احمد بن حنبل علیہ الرحمۃ کی ایک نیک اور صالح لڑکی تھی، بزرگوں سے اسے عقیدت ومحبت تھی، اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اِمام شافعی علیہ الرحمۃ کا تذکرہ نہایت

عقیدت سے کیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے لڑکی کے دِل میں حضرت اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی عقیدت واحترام کا جذبہ تھا، حسنِ اتفاق سے ایک رات اِمام شافعی علیہ الرحمۃ اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گھر آئے، نماز سے فارغ ہونے کے بعد اِمام شافعی علیہ الرحمہ لیٹ گئے اور اِمام احمد علیہ الرحمۃ نوافل میں مشغول ہوگئے اور فجر تک لیٹے رہے، لڑکی نے یہ دیکھ کر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے کہا: آپ اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ بار بار کرتے تھے، مگر میں نے انہیں ایسا نہیں پایا، رات بھر انہیں سوتے دیکھا ہے۔

اِمام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، حضرت اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے، اور پوچھا: آج رات کیسی گزری؟ اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: آج کی رات بڑی بابرکت تھی، آج رات میں نے سو مسائل ترتیب دیئے ہیں جو اہلِ اسلام کے نفع کے لئے ہیں۔

جب اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کیفیتِ حال معلوم ہوئی تو اپنی لڑکی سے کہا: جو کام اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے لیٹ کر کیا ہے، ہماری شب بیداری سے ہزار گنا بہتر ہے۔

ایک دُوسرا واقعہ اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اِمام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، اِمام شافعی علیہ الرحمۃ کے لئے ہر نماز میں دُعا کیا کرتے تھے، ان کے لڑکے نے پوچھا: اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کون شخص ہیں جن کے لئے ہر نماز میں آپ دُعا کیا کرتے ہیں؟ اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: وہ دُنیا کے لئے آفتاب اور لوگوں کے لئے عافیت ہیں۔ (السمیر المہذب)

⑧.....حضرت علی رضی اللہ عنہ جب کوفہ تشریف لے گئے تو دیکھا حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگرد لوگوں میں دِین اور تفقہ کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور کوفہ کی مسجد میں جب چار سو کے قریب دواتیں دیکھیں جن سے طلبہ کرام کتابتِ علم میں مصروف تھے تو ان سے خوش ہو کر فرمایا کہ: عبداللہ بن مسعود نے ان کو کوفہ کے روشن چراغ بنا کر چھوڑا ہے۔

(مقامِ ابی حنیفہ، ص: ۵۷)

⑨.....حضرت جابر بن عبداللہؓ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے پتہ چلا کہ عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنی ہے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے، چنانچہ میں نے ایک اُونٹ خریدا اور اس پر کجاوہ کسا اور ایک مہینے کی مسافت طے کر کے ان کے دروازے پر پہنچا، دربان سے کہا: "قل له جابر على الباب" کہو کہ دروازے پر جابر کھڑے ہیں) دربان نے جا کر کہا، تو انہوں نے اندر سے پوچھا: جابر ابن عبداللہ؟ میں نے کہا: ہاں! چنانچہ وہ باہر نکلے اور مجھے گلے سے لگایا، پھر میں نے عرض کیا: "حديث بلغني عنك انك سمعته عن رسول الله صلى الله عليه وسلم" کہ ایک حدیث کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، میں ڈرا کہ اس حدیث کے سننے سے پہلے ہم میں کا کوئی مر نہ جائے اس لئے میں حاضر ہوا ہوں، تو عبداللہ بن انیس نے وہ حدیث اس طرح بیان کی:

"سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: يحشر الله الناس يوم القيامة عراةً غربهما فيناديهم بصوت يسمعه عن بعد كما يسمعه من قرب: أنا الملك وأنا الديّانُ لا ينبغي لأحد أن يدخل الجنة واحد من أهل النار يطلبه بظلمة."

محض اس ایک حدیث کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ایک اُونٹ خریدا اور ایک مہینے کی مسافت طے کی، علمِ دِین حاصل کرنے میں ان لوگوں نے کتنا جتن کیا، کتنی احتیاط برتی، کتنی سعی وکوشش کی ہے۔

⑩.....اِمام ابنِ ابی حاتم رازی حنظلی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: میرے والد نے کہا کہ: طلبِ حدیث کے سلسلے میں سب سے پہلا جو سفر کیا وہ سات سال تک جاری رہا، پیدل چل کر جو مسافت میں نے طی کی، ایک ہزار فرسخ تک تو میں شمار کرتا رہا، جب ہزار سے زیادہ مسافت ہوگئی تو میں نے شمار کرنا چھوڑ دیا، اپنے سفر کی تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کوفہ سے بغداد تک جو بار بار میرا آنا جانا رہا اسے میں نہیں گن سکا کہ کتنی بار آیا گیا ہوں، اور مکہ سے

مدینہ بھی متعدد بار آنے جانے کی نوبت آئی، اور دریا کے راستے سے نکل کر شہر (سلا) کے راستے سے مصر پیدل پہنچا، پھر مصر سے رَملہ، رملہ سے پیدل بیت المقدس جانا ہوا، اسی طرح رملہ سے طبریہ، وہاں سے دمشق، دمشق سے حمص، حمص سے انطاکیہ، وہاں سے طرطوس پیدل چل کر گیا، ابھی حمص میں ابوالیمان سے حدیث سننا رہ گیا تھا، اس لئے پھر طرطوس سے حمص واپس گیا، اور وہاں ان سے حدیث سنی، پھر وہاں سے بستان کے لئے چل پڑا، بستان سے رقہ گیا، رقہ سے دریا کے راستے سے بغداد پہنچا، اور شام جانے سے پہلے واسط سے نیل پہنچا، نیل سے کوفہ آیا، یہ سب سفر پیدل طے کیا تھا جسے میں نے ۲۱۳ھ میں ۲۰ سال کی عمر میں اپنے وطن سے شروع کیا تھا جو ۲۲۱ھ تک جاری رہا۔ (الجامع الاسلامیہ، ص:۱۰۴)

⑪.....خطیب نے عبداللہ بن بریدہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک صحابی رسول، فضالہ بن عبید کے پاس گئے، یہ ان دنوں مصر میں تھے، کہا: اِنّی لم آتک زائرًا، میں آپ کی زیارت کرنے نہیں ایا ہوں میں نے اور آپ نے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، مجھے اُمید ہے کہ آپ کو یاد ہوگی، پوچھا: کون سی حدیث؟ تو انہوں نے پڑھ کر سنائی کہ اس طرح میں نے سنا ہے۔

یہ سفر محض اس لئے تھا کہ تصدیق ہو جائے کہ جو حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی میں نے یاد کر رکھی ہے، اس میں کوئی کمی زیادتی تو نہیں ہوگئی۔ یہ ان حضرات کی کمالِ احتیاط تھی، ہم جیسے لوگ اتنی زحمت کے لئے تیار کیا ہوتے، تصوّر بھی نہیں کر پاتے ؎

''جن کے رُتبے ہیں سوا، ان کو سوا مشکل ہے''

⑫.....حضرت سعید بن مسیّب مشہور تابعی ہیں، ان کا بیان ہے: کنت ارحل الأیام واللیالی فی طلب الحدیث الواحد، میں ایک حدیث کے لئے کئی کئی دن، کئی کئی راتیں سفر میں بتا دیتا تھا۔

⑬.....خطب بغدادی، عثمان نہدی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے ایک حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے پہنچی: ''ان اللہ لیکتب لعبدہ بالحسنة

الواحدة ألف ألف حسنة" کہ اللہ اپنے بندے کی ایک نیکی کے عوض دس لاکھ نیکیوں کا ثواب دے گا۔

پس میں اس حدیث کی تصدیق کے لئے حج کے لئے گیا، حالانکہ میرا حج کا ارادہ نہیں تھا، بلکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مل کر اس حدیث کی تصدیق کرنا تھا، جب میں ان کے پاس پہنچا اور اپنا مقصد بیان کیا تو انہوں نے پوچھا: کون سی حدیث ہے؟ سعید ابن مسیّب نے حدیث پڑھ کر سنائی، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: حدیث اس طرح نہیں ہے جس طرح آپ بیان کر رہے ہیں، بلکہ اس طرح ہے: "ان اللہ لیعطی عبدہ المؤمن بالحسنة الواحدة ألفی ألف حسنة" بے شک اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندے کو ایک نیکی کے عوض بیس لاکھ نیکیوں کا ثواب دے گا۔ پھر اس کی تائید اور توثیق میں کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمایا ہے: "من ذا الذی یقرض اللہ قرضًا حسنًا فیضاعفه له أضعافًا کثیرةً" کہ کون ہے جو اللہ کو قرض دے، قرضِ حسنہ، پس اللہ اسے بڑھاتے ہیں بہت زیادہ بڑھانا۔ ظاہر ہے اللہ کے بہت زیادہ بڑھانے کے مقابلے میں دس لاکھ اور بیس لاکھ کچھ بھی نہیں ہے۔

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ علماء نے حصولِ علم کے لئے کتنی جانکاہی، دِل سوزی، جدوجہد اور ایثار و جتن کیا ہے، تب کہیں جا کر آسمانِ علم و ادب کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے ہیں، اور ان کے علوم آج دفتروں اور کتابوں کی صورت میں مدوّن ہو کر ہم تک پہنچے ہیں، جن سے لوگ فیض یاب ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے، آج ہر طرح کی سہولتوں کے باوجود نہ وہ حوصلہ ہے، نہ اُمنگ، نہ خلوص، نہ جذبہ جو بارآور ہو۔

"ببیں تفاوت رہ ایں کجا تا بکجا ست"

(مأخوذ از رسالہ "آئینۂ مظاہر علوم" مارچ ۲۰۰۰ء)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک..... "وہ ایک متبرک شخص تھا، چہرہ پُرسکون اور روشن تھا، حسن و جمال کا کمال تھا، خوش اخلاق و خوش اندام تھا، جسم نہ بھاری تھا، نہ نحیف، آنکھیں گہری سیاہ تھیں، پلکیں دراز تھیں، آواز میں رُعب تھا، لیکن کرخت نہ تھی، آنکھوں کے

ڈھیلے سفید، چمک دار اور پتلیاں بہت سیاہ تھیں، آنکھوں کے کنارے ایسے تھے کہ ایسا لگتا سرمہ لگا ہوا ہے بھنویں باریک، نہ ایک دُوسرے سے ملتی ہوئی، نہ بالکل الگ بلکہ بیچ میں تھوڑے تھوڑے بال تھے، گردن میں درازی تھی، پیشانی کشادہ تھی، بال سیاہ تھے، ڈاڑھی گھنی تھی، اگر خاموش ہوتا تو اس کے وقار میں اضافہ ہوتا، گفتگو کرتا تو شخصیت نمایاں ہوتی، خوش کلام وخوش گفتار تھا، لہجہ نرم، آواز اثر کرنے والی تھی، الفاظ اس کے منہ سے ایسے نکلتے جیسے موتیوں کی لڑیاں، ایک ایک لفظ واضح، ایک ایک لفظ صاف، آوازِ دِلکش، سنو تو گردوپیش پر چھائی ہوئی محسوس ہو، لیکن اتنی شیریں اور لطیف کہ رگ وجان میں اُترتی ہوئی، میانہ قد، نہ دراز کہ دیکھنے والے کو بُرا لگے، اور نہ اتنا پستہ قد کہ نگاہ دُوسرے کی طرف جائے، وہ خوش شکل وخوش نظر تھا، اس کے ساتھی اس کے گرد جمع رہے، حکم دیتا تو دوڑ پڑتے، اس کی باتوں کو بڑی توجہ سے سنتے اور اپنی آنکھیں اس کی راہ میں بچھاتے، نگاہیں نیچی رکھتے اور اپنی آواز کو اس کی آواز سے بلند نہ کرتے۔''

ابومعبد نے اپنی بیوی کے منہ سے ایسی فصیح اور بلیغ گفتگو پہلے کبھی نہ سنی تھی، وہ زورِ خطابت میں بولتی جارہی تھی کہ ابومعبد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہ:

''قسم خدا کی! یہ حلیہ جو تو نے بیان کیا ہے، یہ کسی عام آدمی کا نہیں، یہ تو وہی بابرکت قدسی رُوح ہے جس کا تذکرہ ہم آنے جانے والوں، اپنوں اور بیگانوں سے سنتے رہے ہیں، قسم خدا کی معبد کی ماں! وہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، اگر میں ان کو پاتا تو ان کو ساتھ دینے کی التجا کرتا۔''

بالفاظِ دیگر..... آپ کا قد نہ بہت لمبا تھا اور نہ پستہ قد تھے، درمیانی سے ذرا نکلتا ہوا تھا، کہیں بھی کھڑے ہوتے نمایاں ہی نظر آتے۔

رُخِ روشن کتابی تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ گورا، سرخی مائل اور چمک دار تھا، سر بڑا اور سینہ چوڑا تھا، جسم صحت مند تھا، سر اور ڈاڑھی کے بال گھنے تھے، سر کے بال کبھی نصف کان تک، کبھی اس سے ذرا نیچے تک، اور کبھی کندھوں پر پڑے رہتے، مونچھیں ترشی ہوئی، آنکھیں

بہت بڑی اور خوبصورت تھیں، ہر وقت ایسا لگتا جیسے سرمہ لگا ہوا ہے، پلکیں گھنی اور لمبی تھیں، آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تھے، جو بھی دیکھتا مرعوب ہو جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسمِ اطہر مضبوط و توانا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں بے پناہ قوّت تھی۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

وأحسن منک لم تر قط عینی
وأجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرأ من کل عیب
کأنک قد خلقت کما تشاء

ایک دُوسرے انداز سے..... بحیرہ تو راہب تھا، کسی نہ کسی رُوحانی درجے پر فائز، آپ کو تو کوئی بھی دیکھتا تو کہہ دیتا کہ یہ کوئی غیر معمولی شخص ہے، عام آدمی نہیں ہے۔ چہرہ چاند کا ہالہ تھا، ایسا لگتا جیسے روشنی جلد سے پھوٹ رہی ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بازو خوبصورت اور سڈول تھے، ہتھیلیاں چوڑی، بھری بھری، اُنگلیاں بڑی بڑی تھیں، ایڑی پتلی، پاؤں گداز، ان کی جلد چمکدار روغنی تھی، پیر دھوتے تو پانی پھسل جاتا، بوندیں ڈھلک ڈھلک کے نیچے گرتیں، چلنے میں متانت تھی اور وقار بھی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے زمین لپٹتی جا رہی ہے، تیز رفتار نہ تھے، بلکہ ہم ساتھ نہ دے سکتے تھے، ساتھ دینے کی کوشش کرتے تو ایسا لگتا جیسے ہم دوڑ رہے ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: آگے آگے رہو، میرے پیچھے فرشتوں کی جگہ ہے۔ (شمائل ترمذی، ص:۵، وسیرۃ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم)

دو غار، دو سفر اور دو یار..... ارشادِ نبوی ہے کہ میں نے جس کسی کے سامنے اسلام پیش کیا، اس نے تھوڑی بہت جھجک ضرور محسوس کی، بجز ابو بکر کے۔ مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے کا شرف حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا، عورتوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، بچوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، بچیوں میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا (حضورؐ کی

صاحبزادی)، آزاد کردہ غلاموں میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، غلاموں میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور باندیوں میں حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو اوّل المسلمین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ علماء نے لکھا ہے کہ مندرجہ بالا افراد کا تقدم اس لئے موجبِ فضیلت نہیں کہ حضرت خدیجہؓ بیوی تھیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ زیرِ کفالت اور کم سن تھے، حضرت زید بن حارثہؓ آزاد کردہ غلام تھے، ان کے برخلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رجالِ اَحرار یعنی آزاد مردوں میں سب سے پہلے تھے، آپؓ بنی تمیم کے سردار، ذی اثر، ذی حشم اور ذی ثروت تھے، اور قریش کے خون بہا، ضمانت اور تاوان کے مقدمے فیصل کرتے تھے، سلیم الطبع، صاحب الرائے اور بُردبار تھے، لہٰذا ایسے شخص کا بلاتردّد اسلام قبول کر لینا موجبِ صد فضیلت ہے۔

ارادۂ ہجرت..... جن دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شعب ابی طالب میں محصور تھے، تو کفار نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی دوبھر کر دی، کیونکہ اُمت کے پہلے مبلغ وہی تھے، بالآخر انہوں نے حبشہ کی جانب ہجرت کا ارادہ کیا، مکہ سے یمن کی جانب پانچ دن کی مسافت طے کر لی تھی تو برک الغماد میں قبیلہ قارہ اور احابیش کا سردار ابن دغنہ ملا، پوچھا: کدھر؟ فرمایا: ''میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، اب چاہتا ہوں کہ سیاحت کروں اور اپنے رَبّ کی عبادت کروں۔ کہا: تم جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے، نہ نکالا جا سکتا ہے، تم آفت زدوں کی مدد کرتے ہو، یتیموں، بیواؤں کا سہارا ہو، صلۂ رحمی تمہارا وتیرہ ہے، مہمان نوازی تمہارا وصف ہے، چلو میں تم کو اپنی پناہ میں لیتا ہوں، اپنے شہر میں رہ کر اپنے رَبّ کی عبادت کرو۔ جن الفاظ میں ابن دغنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا وہ وہی اوصاف ہیں جو حضرت خدیجہؓ نے پہلی وحی کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمائے، فرق یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ مؤمنہ تھیں اور ابن دغنہ پکا کافر، اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ مقامِ صدیقیت، منصبِ نبوّت سے کس درجہ قریب ہے۔

دو غار..... حیاتِ طیبہ میں دو غار، دو سفر اور دو یار بڑی اہمیت کے حامل ہیں، دو غاروں میں پہلا غار جبل نور کا غارِ حرا ہے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس دُنیا سے اُٹھائے

جانے کے ۶۰۰ سال بعد وحی کے ذریعے دوبارہ زمین اور آسمانوں کا رابطہ قائم ہوا، سورۂ علق کی ابتدائی آیات کا پہلی وحی میں نزول ہوا، اس غار کا قرآن مجید میں ذکر نہیں، لیکن احادیث میں تذکرہ موجود ہے۔ جلال الدین سیوطیؒ نے ''تاریخ الخلفاء'' میں لکھا ہے کہ: ابوبکر رضی اللہ عنہ غارِ حرا میں اپنے آقا کے ساتھ رہنے والے ہیں۔

ثورمحورِ نبوّت..... دُوسرا غار ثور ہے، جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے، ادب میں اس غار کی نسبت سے محاورے شامل ہوئے، عربی میں ''رفیق فی الغار''، فارسی اور اُردو میں ''یارِ غار'' سے مخلص ساتھی مراد ہے۔ غارِ ثور میں تین دن اور تین راتیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ محورِ نبوّت میں رہے، اسی موقع پر ارشاد ہوا تھا: ''اے ابوبکر! ان دو کے متعلق تمہارا گمان کیا ہے جن کا تیسرا اللہ ہو'' قرآن کی زبان میں صحابی ہونے کا اعزاز بھی اسی غار میں نصیب ہوا، سورۂ توبہ میں ہے: ''اگر تم رسول کی مدد نہ کرو گے تو اللہ نے اس کی مدد کی جس وقت کافروں نے اس کو نکالا تھا، وہ دو میں کا دُوسرا تھا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے جبکہ وہ اپنے رفیق سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کھاؤ بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

دو سفر..... حیاتِ طیبہ کے دو یادگار سفر ہیں، ایک زمینی اور دُوسرا آسمانی، آسمانی سفر ''معراج'' کہلاتا ہے، زمینی سفر ''ہجرت''۔ سفرِ معراج کے رفیق سیّد الملائک حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں، اور سفرِ ہجرت کے یار و رفیق افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ دونوں موقعوں پر جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں خبر دی۔ معراج کے سفر سے واپسی کے موقع پر مقام ذی طویٰ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رفیقِ سفر سے فرمایا کہ میرے اس واقعے کی قریش کبھی تصدیق نہیں کریں گے، رمز شناس عالم ملکوت نے جواب دیا کہ اس کی تصدیق ابوبکر ابن ابوقحافہ کریں گے، جو آسمانوں پر ''صدیق'' کہلاتے ہیں۔ کفار نے جھٹلایا اور مذاق اُڑانے لگے تو پیکرِ صدق و یقین نے عقل و خرد داؤ پر لگا کر دانشورانِ کفر کو محوِ تماشا کر دیا، اور اپنے آقاؐ کی ایک ایک بات کی تصدیق کی، اسی موقع پر انہیں ''صدیق'' کا لقب عطا ہوا۔

اضطراب..... دُوسرا سفر ہجرت کا ہے، دِین کے لئے ہجرت، جہاد کے بعد سب سے بڑی عبادت ہے۔ سفر کے پہلے مرحلے میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں جبل ثور کی سمت بڑھنے لگے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اضطراب کا عجیب عالم تھا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کبھی آگے چلتے، کبھی پیچھے، کبھی داہنے رُخ پر آجاتے، کبھی بائیں سمت چلنے لگتے، آپؐ کی اس کیفیت کو دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: کیا بات ہے؟ عرض کیا: جب خیال آتا ہے کہ آپ کی تلاش میں کوئی پیچھے نہ آرہا ہو تو پیچھے آجاتا ہوں، جب سوچتا ہوں کہ کوئی آگے گھات میں نہ ہو تو سامنے چلنے لگتا ہوں، فرمایا: اس سے تمہارا مقصد ہے کہ تم شکار ہو جاؤ اور میں بچ جاؤں۔ عرض کی: اس ذات کی قسم جس نے حق کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا ہے، یہی بات ہے، آپ کو کوئی گزند پہنچا تو ایک اُمت رُشد وہدایت سے محروم ہو جائے گی۔

اللہ اکبر..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں اضافہ ہوا تو ظہر کے وقت جبکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تاکید پر نماز شروع کر دی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سہارے سے مصلےٰ تک پہنچے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بائیں پہلو میں بیٹھ گئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کر رہے تھے اور باقی لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کسی اُمتی کے پیچھے نماز ادا نہیں کی بجز ایک بار پوری نماز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں اور ایک دفعہ غزوۂ تبوک کے سفر میں ایک رکعت حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے پیچھے۔ فرمایا کسی نبی نے بھی ایسا نہیں کیا کہ اس نے اپنی اُمت کے ایک صالح فرد کے پیچھے نماز ادا کی ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کل ۱۷ نمازیں پڑھائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو سوال اُٹھا کہ ان کی تدفین کہاں کی جائے؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ

نبی اسی مقام میں سپردِ خاک ہوتا ہے جہاں اس کی رُوح قبض کی گئی ہو۔

خلیفۃ الرسول..... حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے تو پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا: ''لوگو! میں تمہارا امیر بنادیا گیا ہوں، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، پس اگر اچھا کروں تو میری مدد کرو، اور اگر بُرا کروں تو مجھے سیدھا کردو۔ سچائی ایک امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے، تم میں جو کمزور ہے، وہ میرے نزدیک قوی ہے، چنانچہ میں اس کی شکایت دُور کروں گا، اور تم میں جو قوی ہے، وہ میرے نزدیک کمزور ہے، چنانچہ میں اس سے حق لوں گا۔''

یہ وہ پالیسی اسٹیٹمنٹ ہے جسے دُنیا کے حکمرانوں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہئے، اس میں رعایا کی فلاح ہے۔

فتنوں کا زور..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر پاتے ہی ارتداد کی وبا پھوٹ پڑی، زکوٰۃ دینے سے انکار بڑھ گیا، اور جھوٹے نبیوں کے فتنے نے سر اُٹھایا، آپؓ نے بڑے استقلال اور صبر کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رُومیوں سے بدلہ لینے کے لئے حضرت اُسامہؓ کی اِمارت میں لشکر روانہ کرنے کا حکم دیا تھا، حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر صحابہؓ نے اسے ملتوی کرنے کی درخواست کی۔ فرمایا: جس مہم کو اللہ کے رسول نے روانگی کا حکم دیا، اسے میں روک نہیں سکتا، چاہے میں اکیلا رہ جاؤں اور درندے مجھے پھاڑ کھائیں۔ اس عزمِ راسخ کا منحرف عرب قبائل پر بے حد اچھا اثر پڑا، انہوں نے سوچا کہ اگر مسلمان کمزور ہوتے تو رُومیوں سے جنگ کرنے نہ نکلتے۔

ثانی قبر..... دو سال تین ماہ کے مختصر عرصے میں فراستِ صدیقی نے مملکتِ مدینہ کو مستحکم کردیا، ان کا عظیم کارنامہ قرآن مجید کو کتابی شکل میں یکجا کرنا ہے، اسے ''مصحفِ صدیقی'' کا نام دیا گیا۔ وہ پہلے خلیفہ ہیں جو باپ کی زندگی میں سریرِ خلافت پر رونق افروز ہوئے اور باپ کی زندگی میں ۲۲ر جمادی الآخر ۱۳ھ کو ۶۳ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور اپنے آقا کے پہلو میں قیامت تک کے لئے محوِ استراحت (ثانی قبر) ہیں۔ (روزنامہ ''ایکسپریس'' ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء)

نکاح میں فضولیات سے نجات کا طریقہ..... حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

ارشاد فرماتے ہیں: ''اس معاملے میں سب سے زیادہ ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو کھاتے پیتے امیر اور دولت مند گھرانے کہلاتے ہیں، اس عذاب سے نجات اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کھاتے پیتے اور امیر کہلانے والے لوگ اس بات کا اقدام نہ کریں کہ ہم اپنے خاندان میں شادیاں اور نکاح سادگی کے ساتھ کریں گے اور ان غلط رسموں کو ختم کردیں گے، اس وقت تک تبدیلی نہیں آئے گی، اس لئے کہ ایک غریب آدمی تو یہ سوچتا ہے کہ مجھے اپنی سفید پوشی برقرار رکھتے ہوئے اور اپنی ناک اُونچی رکھنے کے لئے مجھے یہ کام کرنا ہی ہے، اس کے بغیر میرا گزارا نہیں ہوگا، اگر لڑکی کو جہیز نہیں دیں گے تو سسرال والے طعنے دیا کریں گے کہ کیا لے کر آئی تھی؟ آج جہیز کو شادی کا ایک لازمی حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔ گھر گرہستی کا سامان مہیا کرنا جو شوہر کے ذمے واجب ہے، گویا کہ وہ باپ اپنی بیٹی اور جگر کا ٹکڑا بھی شوہر کو دیدے اور اس کے ساتھ لاکھوں روپیہ بھی دے، گھر کا فرنیچر مہیا کرے اور اس طرح وہ دُوسرے کا گھر آباد کرے، شریعت میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں۔

ٹھیک ہے اگر کوئی باپ اپنی بیٹی کو کوئی چیز دینا چاہتا ہے تو وہ سادگی کے ساتھ دیدے، بہرحال جو متمول اور کھاتے پیتے گھرانے کہلاتے ہیں، ان پر یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے، وہ جب تک اس سادگی کو نہیں اپنائیں گے اور اس کو ایک تحریک کی شکل میں نہیں چلائیں گے، اس وقت تک اس عذاب سے نجات ملنی مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ بات ہمارے دِلوں میں ڈال دے..... آمین۔ (اصلاحی خطبات)

حضرت بایزید بسطامیؒ اور ایک یہودی عالم کا مباحثہ..... حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ زبردست عالم، صاحبِ فضل وکمال، انسان دوست صوفی اور صاحبِ کشف وکرامات شخص تھے۔ ایک دن مراقبے میں مصروف تھے کہ غیب سے ندا آئی: ''اے بایزید! تم یہود کا لباس زیبِ تن کرکے یہودیوں کے دیر سمعان میں جاؤ، وہاں ان کی عید ہورہی ہے، اس میں شرکت کرو۔'' اس ندائے غیبی کو سن کر حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ گھبرا گئے اور اس کو شیطانی فریب سمجھ کر سنی اَن سنی کردی، لیکن پھر دوبارہ وہی ندائے غیبی آتی ہے، حضرتؒ کے دِل ودِماغ

نہایت متأثر اور پریشان ہو گئے، پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے سنی اَن سنی کر دی، لیکن جب تیسری مرتبہ پھر آواز آئی کہ: ''بایزید! تم یہودیوں کا لباس پہن کر دیر سمعان جا کر ان کی عید میں شرکت کرو اور اس غیبی ندا کو خدائی آواز سمجھو، یہ کوئی شیطانی فریب کاری نہیں ہے۔'' یہ سنتے ہی حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہو گئے، یہودیوں کا لباس پہنا اور بسم اللہ کر کے دیر سمعان تشریف لے جا کر ان کی عید میں شریک ہو گئے۔ یہودی جوق در جوق اس مجمع میں شرکت کر رہے تھے، بڑے بڑے یہودی عالم مسند نشین ہو رہے تھے، جب آنے کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو ان کا ایک بڑا یہودی عالم جو اُن کا راہب سمجھا جاتا تھا، اُٹھا اور اِسٹیج پر براجمان ہوا لیکن وہ راہب کچھ بولنے پر قدرت نہ رکھ سکا، قوّتِ بیان کی کیفیت سلب ہو گئی، چرب زبانی اور طلاقتِ لسانی ختم ہو گئی اور اس راہب نے اپنے دِل پر ایک عجیب و غریب اثر محسوس کیا، جب دیر تک اسی حالت میں کھڑا رہا تو عوام میں کھلبلی مچ گئی، ایک دُوسرے سے چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں، تمام مجمع سناٹے کی چادر میں لپٹا گم صم احمقوں کی طرح ایک دُوسرے کو تکنے میں مشغول تھا، اس حالت کو جب دیر ہو گئی تو عوام نے ہمت کر کے علمائے یہود سے اس سکوت سناٹے اور نہ بولنے کا سبب پوچھا، کسی عالم نے کہا: شاید کچھ سوچنے میں مصروف ہیں، کسی نے کہا: حالتِ اِستغراق میں ہیں، لیکن اس راہب نے عوام کی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا: ''معلوم ہوتا ہے کہ آج ہماری اس تقریب میں کوئی محمدی شخص آ گیا ہے، میں تقریر نہیں کروں گا، کیونکہ وہ ہمارا امتحان لینے آیا ہے۔'' یہ سن کر تمام مجمع غصّے اور جوشِ انتقام میں بھڑک اُٹھا اور تمام یہودیوں نے اس راہب سے کہا کہ آپ ہم کو اِجازت دیجئے تا کہ ہم اس کو قتل کر دیں، راہب نے کہا کہ: بغیر کسی دلیل و برہان اور خاص وجہ کے قتل و قتال نہ کرنا چاہئے، قتل کے بجائے پہلے اِتمامِ حجت کے طور پر اس محمدی سے بات کر لو، پھر دیکھا جائے گا۔ یہ سن کر مجمع کی تجسّسانہ نظریں اس محمدی کو تلاش کرنے لگیں، لیکن بے سود، آخر کار راہب نے کہا کہ: ''اے محمدی شخص! میں تجھ کو تیرے نبی کا واسطہ دیتا ہوں کہ تو جس جگہ بیٹھا ہے وہیں کھڑا ہو جا، اگر تو نے ہم کو مطمئن کر دیا تو ہم تیری اتباع کریں گے، لیکن اگر تو اسلام سے متعلق ہمارے شکوک و

شبہات رفع نہ کر سکا تو ہم قتل سے دریغ نہ کریں گے۔''

حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ فوراً کھڑے ہو گئے، مجمع کی منتظر نظروں کو سکون ہوا، حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: سوال کرو، اِن شاء اللہ جواب پاؤ گے۔ راہب نے اوّلاً سوال کیا۔

راہب: بتاؤ ایک کیا ہے جس کا دُوسرا نہیں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ اللہ کی ذات ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔

راہب: وہ دو کیا ہے جس کا تیسرا نہیں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ رات اور دن ہیں جن کا تیسرا نہیں۔

راہب: وہ تین کیا ہیں جن کا چوتھا نہیں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ عرش، کرسی اور علم ہیں۔

راہب: وہ چار کیا ہیں جن کا پانچواں نہیں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ توریت، زبور، اِنجیل اور قرآن ہیں۔

راہب: وہ پانچ کیا ہیں جن کا چھٹا نہیں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ پانچ فرض نمازیں ہیں۔

راہب: وہ چھ کیا ہیں جن کا ساتواں نہیں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ چھ دن ہیں جن میں زمین و آسمان بنائے گئے۔

راہب: وہ سات کیا ہیں جن کا کوئی آٹھواں نہیں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ سات آسمان ہیں (سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا)۔

راہب: وہ آٹھ کیا ہیں جن کا کوئی نواں نہیں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ عرش کو اُٹھانے والے آٹھ فرشتے ہیں۔

راہب: وہ نو چیزیں کیا ہیں جن کا دسواں نہیں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ قومِ صالح کی نو مفسدین کی بستیاں ہیں۔

راہب: وہ دس کیا ہیں جن کا گیارہواں نہیں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: حجِ تمتع کرنے والے اگر غیر مستطیع ہوں اور قربانی پر قادر نہ ہوں تو دس روزے رکھیں۔

راہب: وہ گیارہ، بارہ اور تیرہ کیا ہیں جن کا خدا نے تذکرہ کیا ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: گیارہ تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی تھے، اور بارہ مہینے ہیں، اور یوسف علیہ السلام نے خواب میں تیرہ لوگوں کو سجدہ کرتے دیکھا تھا۔

راہب: وہ کونسی قوم ہے جس نے جھوٹ بولا اور جنت میں گئی؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی ہیں جنھوں نے جھوٹ بولا اور جنت میں گئے۔

راہب: وہ کونسی قوم ہے جس نے سچ بولا اور دوزخ میں گئی؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ یہود و نصاریٰ ہیں جو ایک دُوسرے کی تکذیب کرنے میں سچے ہیں، لیکن دوزخ میں جائیں گے۔

راہب: ''وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا، فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا، فَالْجَارِیٰتِ یُسْرًا، فَالْمُقَسِّمٰتِ أَمْرًا'' ان آیتوں کی تفسیر اور توضیح کرو۔

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: ذاریات سے مراد ہوائیں ہیں، حاملات سے مراد پانی سے بھرے ہوئے بادَل ہیں، جاریات سے مراد کشتیاں ہیں، اور مقسّمات سے مراد وہ فرشتے ہیں جو شعبان سے دُوسرے شعبان تک انسانوں کے لئے رزق رسانی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

راہب: وہ کیا چیز ہے جس کی طرف تنفس کی نسبت کی گئی ہے، لیکن اس میں رُوح نہیں ہے، پھر بھی تنفس موجود ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ صبح صادق ہے جس میں رُوح نہیں ہے، لیکن پھر بھی تنفس موجود ہے۔

راہب: وہ چودہ کیا ہیں جن کو اللہ نے تکلم کی قوت بخشی ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ سات آسمان اور سات زمینیں ہیں۔

راہب: وہ قبر کونسی ہے جو اپنے مدفون کو لئے پھرتی رہی؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: حضرت یونس علیہ السلام کی مچھلی، جو تین یوم آپ کو لئے پھرتی رہی۔

راہب: وہ کونسا پانی ہے جو نہ زمین سے نکلا، نہ آسمان سے برسا؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کو جو پانی بھیجا تھا وہ گھوڑوں کو پسینہ تھا، جو نہ آسمان کا تھا، نہ زمین کا۔

راہب: وہ چار چیزیں بتاؤ جو نہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں اور نہ باپ کی پشت سے گزریں؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: حضرت اسماعیل علیہ السلام کا مینڈھا، حضرت صالح علیہ السلام کی اُونٹنی، حضرت آدم علیہ السلام، حضرت حوا علیہا السلام۔

راہب: سب سے پہلے زمین پر کس کا خون بہا؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ ہابیل کا خون تھا، جن کو ان کے بھائی قابیل نے قتل کر دیا تھا۔

راہب: وہ کیا چیز ہے جس کو اللہ نے پیدا کیا اور خود ہی خرید لیا؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: مؤمن کا نفس، جس کو خدا نے پیدا کر کے خرید لیا۔

راہب: وہ کونسی آواز ہے جس کو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس کی بُرائی کی؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ گدھے کی آواز ہے۔

راہب: وہ کونسی مخلوق ہے جس کو خدا نے پیدا کر کے اس کی عظمت سے خوف دِلایا ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ عورتوں کا مکر ہے، قرآن میں ہے: "اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ"۔

راہب: وہ کیا ہے جس کو خدا نے خود پیدا کیا، مگر خود ہی اس کے متعلق سوال بھی کیا؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ہے، جسے اللہ نے پیدا کیا، پھر اسی کے متعلق اِستفسار کیا: "وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی."

راہب: عورتوں میں بزرگ ترین عورتیں بتاؤ؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: حضرت حواؑ، حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت آسیہؑ، حضرت

فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت مریم علیہا السلام۔

راہب: دریاؤں میں سب سے افضل کونسا دریا ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: دریاؤں میں بہترین جیحون، سیحون، دجلہ، فرات اور نیل ہیں۔

راہب: بزرگ ترین پہاڑ بتاؤ؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: جبلِ طور بزرگ ترین پہاڑ ہے۔

راہب: بزرگ ترین چوپایہ بتاؤ؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: گھوڑے بزرگ ترین چوپائے ہیں۔

راہب: بارہ مہینوں میں سب سے افضل مہینہ کون سا ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: بہترین اور افضل مہینہ رمضان کا ہے۔

راہب: بہترین رات کونسی ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: بہترین رات لیلۃ القدر ہے۔

راہب: ایک درخت میں بارہ ٹہنیاں ہیں، ہر ٹہنی میں تیس پتے ہیں، ہر پتے میں پانچ پھول ہیں، دو پھول دُھوپ میں ہیں، اور تین پھول سائے میں، بتاؤ کیا چیز ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: درخت سے مراد سال ہے، ٹہنی سے مراد بارہ مہینے ہیں، تیس پتوں سے مراد ۳۰ دن ہیں، پانچ پھول سے پانچ نمازوں کی طرف اشارہ ہے، جن میں ظہر اور عصر کی دن میں، باقی شام میں ادا ہوتی ہیں۔

راہب: گدھا جب ہنہناتا ہے تو کیا کہتا ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: لعن اللہ العشار (ٹیکس وصول کرنے والوں پر اللہ کی لعنت ہو)۔

راہب: کتے کی آواز کیا ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: ویل لأهل النار من غضب الجبار (اہلِ جہنم پر خدا کی عظمت سے ہلاکت نازل ہو)۔

را... ں آواز کیا ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ۔

راہب: اُونٹ کی آواز کیا ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: حَسْبُنَا اللّٰہُ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا۔

راہب: طاؤس کی آواز کیا ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی۔

راہب: بلبل کی آواز کیا ہے؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: سُبْحَانَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ۔

راہب: وہ کیا چیز ہے جس پر خدا نے وحی بھیجی لیکن نہ وہ انسان ہے، نہ ملائکہ؟

بایزید رحمۃ اللہ علیہ: وہ شہد کی مکھی ہے، قرآنِ کریم میں ارشادِ ربانی ہے: "وَأَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ"۔

یہودی راہب کے ان تمام سوالات کے تسلی بخش جواب دینے کے بعد حضرت اِمام بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اے راہب! اگر کوئی اور سوال ہو تو بتاؤ؟ راہب نے انکار کر دیا اور کہا کہ: مجھے اب کچھ دریافت کرنا نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: اب مجھے تم سے صرف ایک سوال کرنا ہے، اے راہب! تو آسمانی کتابوں سے واقف، اس کے اسرار و غوامض سے باخبر اور اَحکامات و فرمانات سے آگاہ ہے، صرف ایک سوال کا جواب دو کہ جنت اور آسمان کی کنجی کیا ہے؟ راہب اس سوال کو سن کر حیرت زدہ ہو گیا، فکر و غم کے آثار اس کے چہرے سے ہویدا ہو گئے، اَنجانا سا خوف اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگا، حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ: میں نے اتنے سوالات کے جوابات دیئے، لیکن تمہارا راہب ایک سوال کا جواب دینے سے بھی اعراض کر رہا ہے، راہب نے یہ سن کر کہا کہ: میں جواب دینے کو تیار ہوں، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ حاضرین میری موافقت نہ کریں گے۔ یہ سن کر حاضرین نے ایک زبان ہو کر کہا کہ: اگر کوئی حق بات ہے تو آپ صاف ظاہر کر دیں، ہم آپ کی موافقت اور متابعت کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں، اپ

ہمارے سردار ہیں، اگر کوئی ہدایت آپ کی نظر میں ہمارے لئے مفید ہے تو اُسے صاف طور پر ظاہر کر دیجئے۔

یہ سن کر راہب نے دبی آواز میں کہا کہ: سچ بات یہ ہے کہ جنت کی کنجی ''لا اِلٰہ اِلاَّ اللہ محمد رسول اللہ'' ہے۔

راہب کی زبان سے یہ سن کر تمام حاضرین نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا، اور یہودیت کے زُنار توڑ ڈالے گئے، مخصوص لباس تبدیل کر دیئے گئے، اور تمام لوگ حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گئے، پھر بایزید رحمۃ اللہ علیہ کو اِلہامِ غیبی ہوا اور کہنے والے نے کہا:

''تو نے ہماری خاطر یہودیت کا لباس پہنا تھا، ہم نے اس اطاعت کے صلے میں تیری وساطت سے ایک جمِ غفیر کو اسلام میں داخل کر دیا۔''

سچ ہے: ''اللہ اگر توفیق نہ دے، انسان کے بس کی بات نہیں!''

سلطنت کی قیمت..... ایک مرتبہ ہارون الرشید عباسی نے پینے کے لئے پانی مانگا، مجلس میں اس وقت مشہور عالم و زاہد ابن سماک رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود تھے، پانی آ گیا اور ہارون الرشید پینے ہی کو تھا کہ ابن سماکؒ نے کہا: ''ذرا ٹھہر جایئے! اگر آپ سے یہ پانی روک لیا جائے تو اسے حاصل کرنے کے لئے آپ کیا خرچ کر سکیں گے؟''

ہارون نے جواب دیا: ''پیاس کو بجھانے کے لئے اگر ایک پیالہ نصف سلطنت کے عوض بھی ملے تو میں یہ قیمت دینے کو تیار ہوں۔''

پھر جب ہارون نے پانی پی لیا تو ابن سماک رحمۃ اللہ علیہ بولے: ''امیر المؤمنین! اگر یہ پانی جو آپ نے پیا ہے، جسم کے اندر رُک جائے اور باہر خارج نہ ہو سکے تو اس کے نکلوانے کے لئے آپ کیا خرچ کر سکیں گے؟'' ہارون نے کہا کہ: ''ایسی صورت میں ساری سلطنت دے ڈالوں گا۔''

ابن سماک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''یہ ساری سلطنت جو ایک چُلّو پانی کے عوض دی

جاسکتی ہے، اس پر اِترانا اور غرور وتکبر میں انجام کو بھول جانا کہاں کی عقلمندی ہے؟ خدا کا خوف کیجئے اور اس کی مخلوق کے ساتھ نیک سلوک کو ہرگز فراموش نہ کیجئے!'' ہارون الرشید پر اس نصیحت کا بہت اثر ہوا اور وہ دیر تک گردن جھکائے روتا رہا۔

عربی زبان کی خصوصیات..... عربی زبان سائنٹفک بنیادوں پر کام کرتی ہے، اسلام کی اقدار کی طرح اس کے قواعد بھی مستقل اور جامع ہیں، اس میں انگریزی کی طرح Put پٹ اور But بٹ کی سی افراتفری نہیں ہے، اس لئے طالبِ علم کے ذہن پر زیادہ زور نہیں پڑتا، ابتداء میں ایسے اساتذہ کی اشد ضرورت پڑے گی جو طلباء میں اس زبان کا شوق اور لگن پیدا کریں، عربی کے سہل الحصول ہونا اس مثال سے واضح ہے عربی میں ہر ہر لفظ کا ایک مادّہ ہوتا ہے، مثلاً علم کا مادّہ ع ل م ہے، اب علم کے جتنے بھی مشتقات ہوں گے ان میں یہ تین حرف بنیادی طور پر موجود ہوں گے، جس سے ان مشتقات کے معنی سمجھنے میں آسانی ہوگی، مثلاً علم سے تعلیم اور تعلّم متعلق ہیں، تعلیم کے معنی دُوسروں کو تعلیم دینا اور تعلّم کے معنی دُوسروں سے علم لینا۔ انگریزی میں ان کے مترادف نالج اور ٹریننگ کے الفاظ ہیں جن سے ایجوکیشن اور انسٹرکشن کو کوئی ربط ہی نہیں، تعلیم اور تعلّم کا علم سے جو رابطہ ہے وہ ایجوکیشن اور انسٹرکشن سے واضح نہیں، تعلیم یافتہ ایجوکیٹڈ سے بھی یہ فرق واضح ہے، متعلّم اور معلّم کا تعلق علم سے واضح ہے، مگر نالج اور لرننگ سے ماسٹر، پروفیسر، پیوپل اور اسٹوڈنٹ کا کوئی ربط نہیں، اسی طرح ''معلوم'' کا مادّہ بھی علم ہے، مگر انگریزی میں نون Known اور لرنڈ Learned کا نالج اور لرننگ سے دُور کا واسطہ بھی نہیں، علم سے معلّم اور متعلّم مشتق ہیں، لیکن لیڈی ٹیچر اور لیڈی یا گرل اسٹوڈنٹ نالج اور لرننگ سے کوسوں دُور ہیں، یہ صرف ایک مادّہ کی مال ہے، اس طرح چند مادّوں پر عبور حاصل کر لینے سے عربی زبان کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔

یہاں عربی زبان کی چند دیگر خصوصیات کا بیان کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا، یہ خصوصیات اس زبان کی وسعت کو ظاہر کرتی ہیں:

① ..... عربی زبان کے حروف بھی بامعنی ہیں، مثلاً ''ق'' (بچا)، ''ل'' (دوستی کرنا)،

''ن'' (نرم ہونا)، ''ف'' (وفا کرنا)، ''ع'' (یاد کر) وغیرہ۔

② .....عربی زبان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ صرف بے نقطہ الفاظ سے بھی مفہوم ادا ہوسکتا ہے، جیسا کہ فیقی کی تفسیر سواطع الہامہ اور سیرتِ پاک کی ایک حالیہ طبع شدہ کتاب، پوری کی پوری بے نقطہ الفاظ پر مشتمل ہیں۔

③ .....عربی زبان میں جامعیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے، دُوسری زبانوں میں جو مفہوم پورے فقروں میں ادا ہوتا ہے وہ اس زبان میں ایک لفظ سے ادا ہو جاتا ہے، مثلاً مفرد الفاظ: رَبّ، رحیم، رحمٰن۔ ''رَبّ'' وہ ذات ہے جو ایک چیز کو ایک حالت سے دُوسری حالت کی طرف نشو ونما دے، یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کو پہنچ جائے۔ ''رحیم'' وہ ذات ہے جو انسان کی محنت کا بہترین بدلہ دے۔ ''رحمٰن'' وہ ذات ہے جس نے انسان کی پیدائش سے قبل ہی اس کی پرورش کے لئے تمام سامان کئے ہیں۔

④ .....عربی زبان میں الفاظ کا اتنا ذخیرہ ہے جس کا مقابلہ کوئی اور ترقی یافتہ زبان نہیں کرسکتی، مثلاً انسان کے اعضاء میں ہر ہر عضو، پھر عضو کے ہر ہر حصے کے نام الگ الگ ہیں، مثلاً عربی میں انسانی ہاتھ کو ''ید'' (ی د) کہتے ہیں، پھر ہاتھ کے مختلف حصوں کے مختلف نام ہیں، اُنگلی کو ''اصبع''، پھر اُنگلیوں کے الگ الگ نام ہیں، ''ابہام'' انگوٹھا، ''سبابہ'' انگوٹھے سے دُوسری اُنگلی، ''وسطیٰ'' تیسری اُنگلی، ''بنصر'' چوتھی اُنگلی، ''خنصر'' پانچویں اُنگلی، اُنگلیوں کے درمیان خلا کو ''خلل''، انگوٹھے اور بنصر کے درمیان فاصلے کو ''شتر''، انگوٹھے اور سبابہ کے درمیان فاصلے کو ''فتر''، فاصلہ درمیان سبابہ اور وسطیٰ کو ''وطب''، فاصلہ درمیان وسطیٰ اور بنصر کو ''عقب''، فاصلہ درمیان ''بنصر'' اور ''خنصر'' کو ''وہیم''، ناخن کو ''ظفر''، اُنگلیوں کے پپوٹوں کو ''اُنمل''، اُنگلیوں اور جوڑوں کی درمیانی ہڈی کو ''سلامہ'' کہتے ہیں۔ اس طرح جسم کے تمام اعضاء کے ہر ہر حصے کے الگ الگ نام ہیں۔ ایک اور مثال سے عربی کی لغت کی مزید وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً جب بچہ رحم میں ہوتا ہے ''جنین''، جب حالتِ پیدائش میں ہو اسے ''سلیل''، جب پیدا ہو ''ولید''، سات دن کے بچے کو ''صدیغ'' اس کے بعد ''طفل'' اور

''صبی''، جب دانت نکلیں ''تفر''، جب دُودھ چھوڑے ''متکرش''، جب دانت توڑے ''قنغ''، جب دانت نکالے ''ابدع''، جب چلنے پھرنے لگے ''فاکع''، جب کسی قدر مضبوط ہوجائے تو ''یاقع''، قریب بلوغت ''حناسی'' اور جب بلوغت کو پہنچ جائے تو ''مراہق'' کہتے ہیں۔

عربی کے مصادر اور مادّہ کے الفاظ کی تقدیم تأخیر سے مختلف ہم معنی الفاظ بنتے ہیں، مثلاً سلب (س ل ب) تین حروف ہیں، ان سے سلب، سبل، لبس، لسب، ملبس اور بسل چھ الفاظ بن گئے، جو سب کے سب بنیادی طور پر بامعنی ہیں۔ ''قمر'' (ق م ر) سے قمر، قرم، مقر، مرق، ارمق، رقم۔ ''سلم'' (س ل م) سے سلم، سمل، لسم، لمس، ملس جیسے الفاظ بنتے ہیں۔

اِمامِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو ''ابوحنیفہ'' کہنے کی وجہ..... ''حنیف'' اس شخص کو کہتے ہیں جو سب سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو رہے، اسلام کو دِینِ حنیف اور ملتِ حنیفہ کہتے ہیں، کیونکہ اسلام بھی اپنے پیروکاروں کو یہ تعلیم دیتا ہے۔ اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے چونکہ زندگی ہی ملتِ حنیفہ کی خدمت کے لئے وقف کی ہوئی تھی، اس لئے ''ابوحنیفہ'' کنیت اختیار فرمائی، جس کا معنی ہے: ''ملتِ حنیفہ والا''، حقیقت یہی ہے، اس کے علاوہ لوگ جو وجوہ بیان کرتے ہیں، وہ دُرست نہیں ہیں، نہ حنیفہ اِمام صاحب کی کوئی لڑکی تھی، اور نہ ہی حنیفہ نامی کسی لڑکی کی موجودگی میں کوئی سوال و جواب کا قصہ پیش آیا۔ (الخیرات الحسان لعلامہ ابن الحجر المکی الشافعی رحمۃ اللہ علیہ بحوالہ خیر الفتاویٰ، ج:۱، ص:۴۹۲)

جمود علی الظاہر کی بدترین مثال..... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**لا یبولن أحدکم فی الماء الدّائم**'' کہ تم میں سے کوئی شخص ہرگز رُکے ہوئے پانی میں جو کہ جاری نہ ہو، پیشاب نہ کرے۔ اس حدیث کی تشریح میں اِمام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مسلم، ج:۱، ص:۱۳۸ پر داؤد بن علی الظاہری کا یہ عجیب مسلک نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک نہی صرف پانی میں بول کرنے سے ہے، لہٰذا اگر رُکے ہوئے پانی کے قریب بول کیا جائے تو بہہ کر پانی میں چلا جائے، یا برتن میں بول کر کے رُکے ہوئے

پانی میں ڈال دیا جائے، یا پاخانہ کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں، ایسے ہی اگر غیر انسان کا بول ہو تب بھی کوئی حرج نہیں، اِمام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''یہ جمود علی الظاہر کی بدترین مثال ہے۔'' (توضیح السنن، ص:۷۷)

تبحرِ علمی کے باوجود لاعلمی کا اعتراف.....عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ: ہم اِمام مالک رحمۃ اللہ عیہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص نے آکر کہا: میں چھ ماہ کی مسافت سے ایک مسئلہ دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہو کیا ہے؟ اس نے بیان کیا، آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔ وہ حیران ہوکر بولا: اچھا تو اپنے شہر والوں سے کیا کہوں؟ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہہ دینا کہ مالک نے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے۔ (حالاتِ مصنفین، ص:۷۹)

کاش! مسلمان کو اللہ پر ایسا اعتماد حاصل ہو جائے.....عالمگیر رحمہ اللہ کے زیرِ نگین ایک ریاست کا والی ہندو راجہ تھا، وہ مر گیا، اس کا بیٹا نابالغ تھا، عالمگیر رحمہ اللہ نے یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ اس لڑکے میں حکومت کرنے کی صلاحیت ہے یا نہیں؟ اسے طلب کیا، اتفاقاً آپ اس وقت حوض کے کنارے پر تھے، مزاحاً لڑکے کو بازوؤں سے پکڑ کر حوض پر لٹکا کر فرمایا: چھوڑ دُوں؟ لڑکے نے کہا کہ: ''جس کا ہاتھ بادشاہ کے ہاتھ میں ہو، اُسے ڈُوبنے کا کیا خوف؟''

ایک بہروپیے کو زاہد کی شکل میں دیکھ کر عالمگیر رحمہ اللہ نے ایک ہزار اشرفی نذرانہ پیش کی، مگر اس نے صرف اہل اللہ کی نقل اُتارنے کی غرض سے اسے ٹھکرا دیا۔ کاش! کہ اہلِ ثروت کے دروازوں پر بھٹکنے والی نظریں اس بہروپیے سے اہل اللہ کی نقل اُتارنے ہی کا سبق حاصل کریں۔ (احسن الفتاویٰ، ج:۱، ص:۴۴۱)

اہلِ علم کے لئے تازیانہ.....ایک مرتبہ حضرت اِمام احمد رحمہ اللہ اپنے اُستاذ حضرت اِمام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں مہمان ہوئے، اِمام شافعی رحمہ اللہ کی صاحبزادی نے مہمان کی دیگر ضروریات کے ساتھ تہجد کے وقت وضوء کے لئے پانی بھی رکھ دیا، صبح کو جب دیکھا کہ پانی

ویسے ہی رکھا ہے تو حضرت اِمام شافعی رحمہ اللہ سے یوں شکایت کی کہ: "طالب علم لیس لہ حظ فی الصلوٰۃ" یہ کیسا طالبِ علم ہے جسے تہجد کی بھی توفیق نہیں ہوتی؟ ایک جلیل القدر اِمام کی صاحبزادی کا یہ جملہ مدعیانِ علم کے لئے تازیانۂ عبرت ہے، اِمام شافعیؒ کے دریافت فرمانے پر اِمام احمد رحمہ اللہ نے عرض کیا کہ: رات آپ کے ہاں جو کھانا کھایا ہے اس کے انوار اس قدر محسوس ہوئے کہ رات بھر عبادت میں گزری، ایک لمحہ کے لئے بھی غفلت نہیں ہوئی، لہٰذا وضوء کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ (احسن الفتاویٰ، ج:۱،ص:۵۶۷)

خواب ہی میں ایک مشکل آیت کا حل دِل میں پڑا

.....سورۂ اَنفال میں واقعۂ بدر کا تفصیلی بیان آیت: "کما أخرجک ربُّک" سے ہوتا ہے، اس میں لفظ "کما" ایک ایسا لفظ ہے جو تشبیہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، تو غور طلب یہ ہے کہ یہاں تشبیہ کس چیز کی، کس چیز سے ہے؟ حضراتِ مفسرین نے اس کی مختلف توجیہات بیان فرمائی ہیں، اِمام تفسیر ابو حیان رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح کے پندرہ اقوال نقل کئے ہیں، ان پندرہ اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"وقبل تسطیر هٰذه الأقوال هنا وقعت علی جملة منها فلم یلق لخاطری منها شئ فرأیت فی النوم أننی أمشی فی رصیف ومعی رجل اباحثه فی قوله "کما أخرجک ربک من بیتک بالحق" فقلت له ما مرّ بی شئ مشکل مثل هٰذا ولعل ثَمَّ محذوفا یصح به المعنٰی وما وقفت فیه لأحدٍ من المفسرین علی شئ طائل ثم قلت له ظهر لی الساعة تخریجه وان ذٰلک المحذوف هو "نصرک" واستحسنت انا وذٰلک الرجل هٰذا لتخریج ثم انتبهت من النوم وانا أذکره." (تفسیر البحر المحیط، ج:۴،ص:۴۵۹،طبع بیروت)

ابوحیان اندلسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: مجھے ان پندرہ اقوال میں سے کسی قول پر اطمینان نہیں تھا، ایک روز میں اس آیت پر غور وفکر کرتے ہوئے سو گیا تو میں نے خواب میں

دیکھا کہ کسی جگہ جارہا ہوں اور ایک شخص میرے ساتھ ہے، میں اسی آیت کے متعلق اس سے بحث کررہا ہوں اور یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے کبھی ایسی مشکل پیش نہیں آئی جیسی اس آیت کے الفاظ میں پیش آئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی لفظ محذوف ہے۔ پھر یکا یک خواب ہی میں میرے دِل میں پڑا کہ یہاں لفظ ''نصرک'' محذوف ہے، اس کو خود میں نے بھی پسند کیا اور جس شخص سے بحث کررہا تھا اس نے بھی پسند کیا، بیدار ہونے کے بعد اس پر غور کیا تو میرا اِشکال ختم ہوگیا کیونکہ اس صورت میں لفظ ''کما'' تشبیہ کے لئے نہیں بلکہ بیانِ سبب کے لئے استعمال ہوا ہے، اور معنی آیت کے یہ ہوگئے کہ غزوۂ بدر میں اللہ کی طرف سے جو خاص نصرت و امداد آپ کی ہوئی، اس کا سبب یہ تھا کہ اس جہاد میں آپ نے جو کچھ کیا کسی اپنی خواہش اور رائے سے نہیں بلکہ خالص حکمِ خداوندی کے تابع کیا، اسی کے حکم پر آپ اپنے گھر سے نکلے اور اطاعتِ حق کا یہی نتیجہ ہونا چاہئے اور یہی ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کی امداد و نصرت اس کے ساتھ ہوجاتی ہے۔

ایفائے عہد کا ایک عجیب واقعہ..... ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور اِمام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم بن عامر کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک قوم کے ساتھ ایک میعاد کے لئے التوائے جنگ کا معاہدہ تھا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ اس معاہدے کے اَیام میں اپنا لشکر اور سامانِ جنگ اس قوم کے قریب پہنچادیں تاکہ معاہدے کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ دُشمن پر ٹوٹ پڑیں، مگر عین اس وقت جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر اس طرف روانہ ہورہا تھا یہ دیکھا گیا کہ ایک معمر آدمی گھوڑے پر سوار بڑے زور سے یہ نعرہ لگارہے ہیں: ''اللہ اکبر، اللہ اکبر، وفائًا لا غدرًا'' یعنی نعرۂ تکبیر کے ساتھ یہ کہا کہ ہم کو معاہدہ پورا کرنا چاہئے، اس کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس قوم سے کوئی صلح یا ترکِ جنگ کا معاہدہ ہوجائے تو چاہئے کہ ان کے خلاف نہ کوئی گرہ کھولیں اور نہ باندھیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر کی گئی، دیکھا تو یہ کہنے والے بزرگ حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ صحابی تھے، حضرت معاویہ رضی

اللہ عنہ نے فوراً اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا تا کہ التوائے جنگ کی میعاد میں لشکر کشی پر اقدام کر کے خیانت میں داخل نہ ہو جائیں۔ (ابنِ کثیر بحوالہ معارف القرآن، ج:۴،ص:۲۷۰)

نفوسِ اِنسانی کی اصلاح کا سب سے اچھا طریقہ..... عالمِ کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض، اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی اصلاح و تکمیل کی جائے، اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے، اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فنِ اخلاق میں اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھی جائیں اور پھیلائی جائیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے زبردستی محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں، یہی طریقے ہیں جو ابتداء سے آج تک تمام دُنیا میں جاری ہیں اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا، لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو، جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے، اور جس کا ایک ایک اشارہ اَوامرِ سلطانی بن جائے، دُنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوسِ قدسیہ کا پرتو ہے، دیگر اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں۔ (مختصراً از سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۱،ص:۳۱)

فرعون پر موسیٰ علیہ السلام کا خوف و ہیبت..... فرعون کی قوم نے سوچا کہ فرعون کے غصّے کا سارا زور جادوگروں پر ختم ہو گیا، موسیٰ علیہ السلام جو اصل مخالف تھے، ان کے بارے میں فرعون کی زبان سے کچھ نہ نکلا اس پر ان کو کہنا پڑا: ''کیا آپ موسیٰ اور ان کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دیں گے کہ وہ آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ کر ہمارے ملک میں فساد کرتے پھریں'' اس پر مجبور ہو کر فرعون نے کہا کہ: ان کا معاملہ ہمارے لئے کچھ قابلِ فکر نہیں، ہم ان کے لئے یہ کام کریں گے کہ ان میں جو لڑکا پیدا ہوگا اس کو قتل کر دیں گے، صرف لڑکیوں کو رہنے دیں گے، جس کا نتیجہ کچھ عرصے میں یہ ہو جائے گا کہ ان کی قوم مردوں سے خالی ہو کر صرف عورتیں رہ جائیں گی، جو ہماری خدمت گار باندیاں بنیں گی۔

علمائے مفسرین نے فرمایا کہ: قوم کے اس طرح جھنجوڑنے پر بھی فرعون نے یہ تو کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کردیں گے، لیکن حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے بارے میں اس وقت بھی اس کی زبان پر کوئی بات نہ آئی، وجہ یہ ہے کہ اس معجزے اور واقعے نے فرعون کے قلب و دِماغ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سخت ہیبت بٹھلا دی تھی۔

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: فرعون کا یہ حال ہوگیا تھا کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتا تو پیشاب خطا ہوجاتا تھا اور یہ بھی بالکل صحیح ہے، ہیبتِ حق کا یہی حال ہوتا ہے ؎

ہیبتِ حق است ایں از خلق نیست

اور مولانا رُومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید
ترسد از وے جن وانس و ہر کہ دید

(معارف القرآن، ج:۴، ص:۳۸)

اللہ کا کوئی ہم نشین نہیں..... موضوعات مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ میں لکھا ہے کہ: بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ: ''قیامت میں اللہ پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا'' اِمام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے سنا تو بہت برہم ہوئے اور اپنے دروازے پر یہ فقرہ لکھ کر لگا دیا کہ: ''اللہ کا کوئی ہم نشین نہیں'' اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے اور اِمامِ موصوف رحمۃ اللہ علیہ کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں۔ (موضوعات علی قاری رحمۃ اللہ علیہ، بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۱، ص:۷۵)

آج کل عام مسلمانوں کی ایک غلطی..... اسمائے حسنیٰ میں سے وہ نام جن کا غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا ناجائز و حرام ہے، مثلاً: رحمٰن، سبحان، رزّاق، خالق، غفار، قدوس وغیرہ، پھر ان مخصوص ناموں کو غیر اللہ کے لئے استعمال کرنا اگر کسی غلط عقیدے کی بناء پر ہے کہ اس کو ہی خالق یا رازق سمجھ کر ان الفاظ سے خطاب کر رہا ہے تب تو ایسا کہنا کفر ہے، اور اگر عقیدہ غلط

نہیں، محض بے فکری یا بے سمجھی سے کسی شخص کو خالق، رازق یا رحمٰن، سبحان کہہ دیا تو یہ اگرچہ کفر نہیں مگر مشرکانہ الفاظ کے ہونے کی وجہ سے گناہِ شدید ہے۔

افسوس ہے کہ آج کل عام مسلمان اس غلطی میں مبتلا ہیں، کچھ لوگ تو وہ ہیں جنھوں نے اسلامی نام ہی رکھنا چھوڑ دیئے، ان کی صورت وسیرت سے تو پہلے بھی مسلمان سمجھنا ان کا مشکل تھا، نام سے پتہ چل جاتا تھا، اب نئے نام انگریزی طرز کے رکھے جانے لگے، لڑکیوں کے نام خواتینِ اسلام کے طرز کے خلاف خدیجہ، عائشہ، فاطمہ کے بجائے نسیم، شمیم، شہناز، نجمہ، پروین ہونے لگے۔ اس سے زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ جن لوگوں کے اسلامی نام ہیں، عبدالرحمٰن، عبدالخالق، عبدالرزّاق، عبدالغفار، عبدالقدوس وغیرہ، ان میں تخفیف کا یہ غلط طریقہ اختیار کرلیا گیا کہ صرف آخری لفظ ان کے نام کی جگہ پکارا جاتا ہے، رحمٰن، خالق، رزّاق، غفار کا خطاب ان لوگوں کو دیا جارہا ہے، اور اس سے زیادہ غضب کی بات یہ ہے کہ ''قدرت اللہ'' کو ''اللہ صاحب'' اور ''قدرت خدا'' کو ''خدا صاحب'' کے نام سے پکارا جاتا ہے، یہ سب ناجائز وحرام اور گناہِ کبیرہ ہے، جتنی مرتبہ یہ لفظ پکارا جاتا ہے اتنی ہی مرتبہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ہوتا ہے، اور سننے والا بھی گناہ سے خالی نہیں رہتا، یہ گناہِ بے لذت اور بے فائدہ ایسا ہے جس کو ہمارے ہزاروں بھائی اپنے شب وروز کا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں اور کوئی فکر نہیں کرتے کہ اس ذرا سی حرکت کا انجام کتنا خطرناک ہے۔ (معارف القرآن، ج:۴، ص:۱۳۳)

ایک عابد کا قصہ..... ایک عابد نے اپنی بیوی کے لئے رُوئی خریدی، ان کی بیوی نے رُوئی فروخت کرنے والوں کی غیبت کی اور کہا کہ: ''ان لوگوں نے تمہارے ساتھ خیانت کی ہے'' پس اس پر انہوں نے بیوی کو طلاق دے دی، کسی نے عابد سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس نے جواب دیا کہ: ''اس نے غیبت کی تھی، تو میں نے اس کو طلاق دے دی تاکہ روزِ قیامت جب مطالبہ کرنے والے خصماء مجھے گھیر لیں گے تو میں نے اس دن کی ندامت و شرمندگی سے اپنے کو بچانے کے لئے بیوی کو طلاق دے دی۔'' (تنبیہ الغافلین، بحوالہ نفع المفتی والسائل، ص:۳۳۱)

اللہ کی رَسّی کو تھامنے کا طریقۂ کار.....شیخ محی الدین ابن عربی (متوفی ۶۳۸ھ) بہت بڑے صوفیائے دِین میں سے ہیں اور بہت بلند درجہ اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں، وہ کہتے ہیں، صرف ان کا اپنا دعویٰ نہیں، قرآن وحدیث سے بھی یہی نکلتا ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک جتنا علاقہ ہے یہ جہنم کا علاقہ ہے، اسی میں قیامت کے دن آگ اور تکلیف دہ چیزیں نمایاں ہوں گی، تو اَب یوں سمجھنا چاہئے کہ اس وقت ہم سب جہنم میں موجود ہیں، حق تعالیٰ نے اُوپر سے ایک رَسّی لٹکائی کہ جسے نکلنا ہو وہ اس رَسّی کو پکڑ لے، جب ہم اس رَسّی کو کھینچیں گے وہ کھنچ کر ہمارے پاس آجائے گا اور اس علاقے سے نکل جائے گا، یہ رَسّی درحقیقت قرآنِ کریم ہے، اسی کو قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ہے:

"واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا".....ترجمہ: اللہ کی رَسّی کو مضبوط تھام لو۔

یہ لٹکائی ہوئی رَسّی ہے جو عرش سے لٹکائی گئی ہے اور زمین پر آئی ہوئی ہے، جب وہ رَسّی کھنچ کر اُوپر جائے گی تو جنھوں نے اس رَسّی کو تھام رکھا ہے وہ بھی اس علاقہ جہنم سے کھنچ کر اُوپر کو چلے جائیں گے تو کفار کو جہنم میں داخل کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی وہ تو ہیں ہی جہنم میں، مؤمن کو بھاگ نکلنے کی ضرورت ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ رَسّی کو مضبوط تھام لے، جب رَسّی کھینچی جائے گی یہ بھی کھنچ کر اس علاقہ جہنم سے نکل جائے گا۔

اب ظاہر بات ہے کہ رَسّی کوئی سن کی بٹی ہوئی تو ہے نہیں اور ریشم کی نہیں کہ اس کو ہاتھ سے تھاما جاسکے، یہ تو علوم وکمالات کی رَسّی ہے، جس کے تھامنے کے معنی یہ ہیں کہ دِل سے ایمان لاکر اسے دِل میں جمائے، یہ ہاتھ سے پکڑنے کی چیز نہیں، دِل سے پکڑنے کی چیز ہے۔ (خطبات حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ، ج:۱۰، ص:۸۵)

یقین وایمان کی دولت کس طرح حاصل کی جائے؟.....اللہ کی ایک کریمانہ سنت یہ ہے کہ اگر کوئی بندہ جس کو یقین کی دولت ابھی نصیب نہیں ہے، مگر وہ اس کا طالب ہے، تو اگر وہ اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری والی اہلِ یقین کی سی زندگی گزارنے لگے اور اللہ کے دِین کے راستے میں اور اس کی رضا طلبی میں اپنی خواہشات اور اپنے مال وجان کو اِخلاص کے ساتھ

اصحابِ یقین کی طرح قربان کرنے لگے، تو اللہ تعالیٰ اس کو دولت سے محروم نہیں رکھتے، اسی طرح طلبِ صادق کے ساتھ کسی صاحبِ یقین بندے کی صحبت اس مقصد کے لئے ہزاروں برس کی مجرّب اکسیر ہے، اور ہماری یہ دُنیا ایسے بندوں سے ابھی خالی نہیں ہوئی ہے۔ (ملفوظ حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ)

عربی زبان کی ابتداء کب سے ہوئی؟.....ابوالبرکات جونی جو اَنسابِ عرب کے بڑے ماہر مشہور ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ ہود علیہ السلام کے بیٹے یعرب بن قحطان ہیں جو یمن میں جا کر آباد ہوئے اور یمنی اقوام انہیں کی نسل ہیں، اور عربی زبان کی ابتداء انہیں سے ہوئی، اور یعرب کی مناسبت سے ہی زبان کا نام ''عربی'' اور اس کے بولنے والوں کو ''عرب'' کہا گیا۔

مگر صحیح یہ ہے کہ عربی زبان تو عہدِ نوح علیہ السلام سے جاری تھی، کشتی نوح کے ایک رفیق جرہم تھے، جو عربی زبان بولتے تھے۔ (بحر محیط) اور یہی جرہم ہیں جن سے مکہ معظّمہ کی آبادی شروع ہوئی، ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ یمن میں عربی زبان کی ابتداء یعرب بن قحطان سے ہوئی اور ابوالبرکات کی تحقیق کا یہی مطلب ہو۔ (معارف القرآن، ج:۳، ص:۶۰۰)

عورت اور منصبِ افتاء.....فقہ کی کتاب ''بدائع الصنائع'' کی وجہِ تصنیف یہ ہوئی کہ ایک بہت بڑے محدث کی لڑکی بڑی عالمہ اور محدثہ تھی، اور اس کے ساتھ ساتھ بہت حسین اور خوبصورت تھی، بہت بڑے بڑے علماء کے پیغام نکاح کے آئے اور ایسے ہی سلاطین وغیرہ نے بھی پیغام بھیجے، مگر تمام سے اس لڑکی کا علم زیادہ تھا، اس لئے پیغام قبول نہیں ہوتا تھا، اس لڑکی نے یہ شرط مقرر کی کہ تمام علماء فقہ میں کتابیں تصنیف کریں، جس کی کتاب مجھے پسند ہوگی، میں اس کے ساتھ نکاح کرلوں گی، اس پر ہزاروں کتابوں کی تصنیف ہوئی تو اسے ''بدائع الصنائع'' پسند آئی، اور اسی سے اس نے نکاح کیا۔ (خطبات حکیم الاسلام، ج:۳، ص:۳۱۸)

علم کی عزّت تبلیغ ہی میں ہے.....ایک مرتبہ حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ طوائفوں کو تبلیغِ حق کرنے پہنچ گئے، تو ان کے خدام اور متوسلین نے یہ کہہ کر روکا کہ حضرت!

ایسے بدنام گروہ کے سامنے تبلیغ کے لئے جانا علم کی عزت کو گھٹانا ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ:

''اللہ کی قسم! اگر اسماعیل کو گدھے پر سوار کر کے، اس کا منہ کالا کیا جائے اور جوتیوں کا ہار اس کے گلے میں ڈال دیا جائے اور اس کے پیچھے بچے آوازیں دیتے ہوئے اسے شہر سے باہر نکال رہے ہوں اور اسماعیل قال اللہ قال الرسول کہتا ہوا جا رہا ہو تو یہی اس کی انتہائی عزت اور سربلندی ہے، جس کے بعد اسے کسی عزت کی ضرورت نہیں۔'' (خطبات حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ، ج:۱۰، ص:۲۳۸)

شرم وحیاء کی قسمیں.....حیاء کا معنی ہے: ''خُلُقٌ یبعث الانسان علی اجتناب القبیح ویمنع من التقصیر فی حق ذی الحق'' یعنی وہ ملکہ جو حرکاتِ قبیحہ سے بچنے پر انسان کو برانگیختہ کرتا ہے اور صاحبِ حق کے حق میں کوتاہی کرنے سے روکتا ہے۔

حیاء کی اقسام دس ہیں:

①.....حیائے جنایت: جیسے حضرت آدم علیہ السلام جنت میں قصور کر کے جب بھاگنے لگے تو حق تعالیٰ نے پوچھا: ''فرارًا منّی یا آدم؟'' کیا مجھ سے بھاگتے ہو؟ عرض کیا: ''لا یا رَبّ! بل حیاء منک'' یعنی اے میرے رَبّ! آپ سے شرما کر بھاگ رہا ہوں۔

②.....حیائے تقصیر: جیسے فرشتے باوجود ہمہ وقت عبادت کے قیامت کے روز اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے عرض گزار ہوں گے: ''سبحانک ما عبدناک حق عبادتک'' اے اللہ! تیری ذات بہت پاک ہے، ہم تیری عبادت کا حق ادا نہ کر سکے۔

③.....حیائے اجلال: اللہ تعالیٰ کے جلال سے انسان شرمائے، جس قدر اللہ کے جلال کی معرفت ہوگی، حیاء بھی اتنی ہی ہوگی۔

④.....حیائے کرم: حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا ولیمہ کھانے کے بعد کچھ لوگ بیٹھے باتیں کرتے رہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اُٹھ جانے کا انتظار کرتے رہے، مگر مکارمِ اخلاق کی وجہ سے آپ کچھ کہتے ہوئے شرمائے۔

⑤.....حیائے حشمت: جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ داماد ہونے کی وجہ سے مذی کا

مسئلہ پوچھتے ہوئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرمائے۔

⑥.....حیائے احتقارِ نفس: اپنے نفس کی تحقیر وتصغیر کے پیشِ نظر انسان کا اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگتے ہوئے شرمانا، خود کو گناہگار سمجھنے کی وجہ سے، یا اپنی مانگ کو زیادہ خیال کرنے کی وجہ سے۔

⑦.....حیائے محبت: عاشق کا محبوب سے شرمانا جس کی وجوہات مختلف ہیں۔

⑧.....حیائے عبودیت: اپنی نااہلیت اور اللہ جل شانہ کے مرتبے کا موازنہ کرتے ہوئے محبت وخوف کی ملی جلی ہوئی کیفیت جو عبادت کے وقت پیدا ہو۔

⑨.....حیائے شرف وعزّت: بڑے رُتبے والے کا کسی کو کچھ دیتے ہوئے شرمانا خواہ عطیہ کو حقیر سمجھتے ہوئے یا جس کو دے رہا ہے اسی سے شرمائے۔

⑩.....حیاء بنفسہٖ: اپنی حیثیت اور مرتبے سے کم درجہ کوئی کام کرے، انسان خود اپنے نفس سے شرمائے کہ یہ کام میرے لائق نہیں ہے، تو وہ دُوسرے سے بدرجۂ اَوْلیٰ شرمائے گا۔

(فلاحین، جاجروی)

ایک اہم تنبیہ.....میں اپنے دیرینہ اور مسلسل تجربے کے بعد دیانۃً عرض کرتا ہوں اور مجھ سے اس قول پر اِن شاء اللہ بازپُرس نہ ہوگی، اس وقت تقریباً سب ہی لوگ، کیا عوام، کیا خواص، اِلّا ماشاء اللہ مرضِ نفاق میں مبتلا ہیں، لوگوں کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ، زبان کے بہت اچھے اور دِل کے بہت ہی بُرے۔ (ایک بزرگ کا قول)

ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں.....ابراہیم علیہ السلام کی ایک بیوی حضرت سارہ تھیں جو اِبراہیم علیہ السلام کی چچا کی لڑکی تھیں، جن کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے (جبکہ ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال تھی)، اور اُن سے حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے، جس سے ایک بڑی بھاری قوم بنی اسرائیل کا سلسلہ چل پڑا۔ ابراہیم علیہ السلام کی دُوسری بیوی حضرت ہاجرہ، بادشاہ کی بیٹی تھیں، جن کے بطن سے حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی کا نام ''قطفورا'' ہے،

جن کا نکاح ملکِ شام میں ہوا، قطفورا کا بیٹا مدین تھا اور مدین کا بیٹا یشجب تھا، اور حضرت شعیب علیہ السلام پھر یشجب کے بیٹے تھے۔ (مأخوذ از بعض تواریخ)

چیونٹی بھی عصمتِ انبیاء کی قائل ہے...... سورۃ النمل کی آیت: ۱۸ میں ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ ایسے میدان کی طرف گزر ہوا جہاں چیونٹیوں کی بڑی بھاری بستی تھی، چیونٹی کی قوّتِ شامہ (سونگھنے کی قوّت) اور قوّتِ سامعہ (سننے کی قوّت) چونکہ بہت تیز ہے، اس لئے سلیمان علیہ السلام اور ان کے لشکر کی آمد کی ان کو اطلاع ہوئی، چنانچہ ایک چیونٹی نے کہا: اے چیونٹیو! گھس جاؤ اپنے گھروں میں سلیمان علیہ السلام اور ان کی فوجیں کہیں تمہیں نہ پیس ڈالے اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ یعنی ایسے تو نہیں جو جان بوجھ کر تم کو ہلاک کریں، ہاں! ممکن ہے بے خبری میں پس جاؤ، گویا حضرت سلیمان اور ان کا لشکر کی طرف سے چیونٹی نے ایک عذر بیان کیا، اس آیت کے تحت اِمام فخر الدین رازیؒ لکھتے ہیں:

”کأنما عرفت أن النبی معصوم فلا یقع منه قتل هٰذه الحیوانات اِلَّا علٰی سبیل السهو وفی هٰذا تنبیه عظیم علٰی وجوب الجزم بعصمة الأنبیاء.“ (التفسیر الکبیر، ج:۲۴، ص:۱۸۷)

مطلب یہ کہ چیونٹی یہ سمجھتی ہے کہ جان بوجھ کر نبی قتل تو نہیں کرتا، کیونکہ نبی معصوم ہوتا ہے، ہاں! غلطی سے پس جانے کا خطرہ ہے، یہ بات انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو داغ دار بنانے والوں کے لئے بڑی عبرت اور نصیحت ہے۔

بعض دفعہ اکابر صوفیاء کے کلام کی تأویل ضروری ہے...... بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے عیوب کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہوتا، لہٰذا جس کی بھلائیاں اُس کی بُرائیوں سے زیادہ ہوں تو اُس کی بُرائیاں اُس کی بھلائیوں کی وجہ سے برداشت کرلی جائیں گی۔ سلف وخلف میں محققین کا یہی طریقہ رہا ہے، حتیٰ کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے متشدد حضرات بھی اولیاء اللہ کے کلام کی تأویل کرتے چلے آئے ہیں، اور ان کے فتاویٰ میں بیسیوں جگہ مشہور اکابر صوفیاء کے کلام کی بہت کثرت سے تأویل کی گئی ہے۔ بالخصوص حضرت

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کی توتأ ویل کثرت سے ان کے فتاویٰ میں کی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ: بعض شیوخ کے کلام میں ہے کہ محبت ایک آگ ہے جو محبوب کی مراد کے علاوہ ہر چیز کو جلا دیتی ہے، اس سے بعضوں نے یہ غلط معنی نکالے ہیں کہ دُنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے سب اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہو رہا ہے، تو انہوں نے محبت کا کمال اس کو سمجھا کہ جو ہو رہا ہے سب اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہو رہا ہے اس لئے ہر چیز سے محبت کی جائے، چاہے وہ کفر ہو، فسق ہو، گناہ ہو۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ حالانکہ اس مقولہ سے مراد صاحبِ مقولہ کی یہ تھی کہ محبوب کی مراد سے اللہ تعالیٰ کا وہ ارادہ ہے جو دِینی اور شرعی ہو، یعنی ہر وہ چیز جس کو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں، گویا مقولہ کا مطلب یہ ہوا کہ محبت آگ ہے اور ہر اُس چیز کو جلا دیتی ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہ ہو، اور یہی صحیح معنی ہے کہ محبت کا کمال یہی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں وہی بندہ چاہے۔ (فتاویٰ، ج:۱۰،ص:۲۱۰)

حجاج بن یوسف کو بھی ایک عورت نے شکست دے دی..... حجاج بن یوسف نے غزالہ نامی عورت کا شوہر شبیب خارجی کو جو فرقہ خوارج کا سردار تھا، قتل کر دیا، چونکہ اس کی عورت بہت شجاع اور باغیرت تھی اس لئے بدلہ لینے کی غرض سے ایک لشکر لے کر حجاج کے اُوپر حملہ آور ہوئی، بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت حجاج بن یوسف کے لشکریوں کی تعداد تیس ہزار تھی اور غزالہ کے لشکر کی تعداد ایک ہزار تیس تھی، غزالہ نے بہت ہی ثابت قدمی کے ساتھ مکمل ایک سال تک حجاج سے مقابلہ کیا اور آخر کار حجاج کو شکست دے دی اور حجاج شکست کھا کر بھاگا، تب غزالہ نے اس کی جامع مسجد کے اندر نمازِ فجر ادا کی اور سورۂ بقرہ کی تلاوت کی، مقصود اس سے حجاج بن یوسف کی ذِلت وخواری کو ظاہر کرنا تھا، ایمن بن حزیم انصاری نے اپنے ایک طویل قصیدے کے آخر میں ایک شعر کے اندر اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے:

اقامت غزالة سوق الضراب

لأهل العراقيين حولا قميطا

ترجمہ: ''غزالہ نامی عورت نے اہلِ کوفہ اور بصرہ کے لئے مکمل سال تک

بازارِ جنگ کو رائج کر رکھا ہے۔''

بعض شعراء نے اس جنگ کے بعد حجاج بن یوسف کے بارے میں یہ کلمات استعمال کیے:

أسد علی وفی الحروب نعامه

فتخاء تنفر من صفیر الصافر

هلا کررت علی غزالة فی الوغٰی

بل کان قلبک فی جناحی طیر

ترجمہ: ''تو ہم پر شیر ہے، مگر لڑائیوں میں شتر مرغ ہے، جو اپنے پر کھولے ہوئے اور سیٹی بجانے والے کی آواز سے بھی بھاگ لیتا ہو، ارے بزدل! لڑائی میں غزالہ پر حملہ آور کیوں نہیں ہوا تھا؟ اس وقت تو تیرا دِل ایسا کمزور تھا جیسے چڑیا کا دِل جو اس کے دو پروں کے درمیان ہوتا ہے۔'' (التقریر الحاوی، ج:۱، ص:۲۲۳)

ایک خصوصیت انبیاء کی..... صحیح بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بول و براز اور دیگر فضلات پاک ہیں، لیکن نواقضِ وضوء اور موجباتِ غسل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام اُمت کی طرح ہیں، اور اس پر اجماع بھی ہے، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند کے بارے میں یہ طے ہے کہ اس سے آپ کا وضوء نہ ٹوٹتا تھا اور یہ جملہ انبیاء کے لئے ہے کہ نومِ انبیاء علیہم السلام ناقضِ وضوء نہیں۔ (ردّ المحتار، نواقض الوضوء)

مستعمل پانی کا احترام ضروری ہے..... گندگی کی جگہ پر وضوء نہ کرے، کیونکہ وضوء کے مستعمل پانی کا بھی احترام کرنا ضروری ہے، اس کو نجاست کے مقام پر نہ بہنے دے، جیسا کہ مفاتیح المسائل کے حوالے سے مطالب المؤمنین میں مذکور ہے۔ (نفع المفتی والسائل، ص:۶۱)

کوئی شے بیکار نہیں، کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں..... یوں تو اس کائنات میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت کے بغیر پیدا کی ہو، اس کائنات میں ہر چیز اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت پیدا فرمائی ہے، ہر چیز

کا کوئی نہ کوئی عمل اور فائدہ ضرور ہے، اقبال مرحوم نے خوب کہا ہے ۔

نہیں کوئی چیز نکمّی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں کوئی چیز بُری پیدا نہیں فرمائی، تکوینی اعتبار سے سب اچھی ہیں، ہر ایک کے اندر کوئی نہ کوئی تکوینی مصلحت ضرور ہے، البتہ جب ہمیں کسی چیز کی حکمت اور مصلحت کا پتہ نہیں لگتا تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ چیز بُری ہے، ورنہ حقیقت میں کوئی چیز بُری نہیں، حتیٰ کہ وہ مخلوقات جو بظاہر موذی اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہیں، مثلاً: سانپ، بچھو ہیں، ان کو ہم اس لئے بُرا سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات یہ ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں، لیکن کائنات کے مجموعی انتظام کے لحاظ سے ان میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت ضرور ہے، ان میں فائدہ موجود ہے، چاہے ہمیں پتہ چلے نہ چلے۔

ایک بادشاہ اور ایک مکھی..... ایک بادشاہ کا قصہ لکھا ہے کہ وہ ایک دن اپنے دربار میں بڑے شان وشوکت سے بیٹھا ہوا تھا، ایک مکھی آکر اس کی ناک پر بیٹھ گئی، اس بادشاہ نے اس کو اُڑادیا، وہ پھر آکر بیٹھ گئی، اس نے دوبارہ اُڑادیا، وہ پھر آکر بیٹھ گئی، آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مکھیاں بہت لیچڑ قسم کی ہوتی ہیں، ان کو کتنا ہی اُڑالو، وہ دوبارہ اسی جگہ پر آکر بیٹھ جاتی ہیں، وہ بھی اسی قسم کی تھی۔ بادشاہ نے اس وقت کہا کہ خدا جانے یہ مکھی اللہ تعالیٰ نے کیوں پیدا کی؟ یہ تو تکلیف ہی پہنچا رہی ہے، اس کا کوئی فائدہ تو نظر نہیں آتا۔ اس وقت دربار میں ایک بزرگ موجود تھے، ان بزرگ نے اس بادشاہ سے کہا کہ اس مکھی کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ تم جیسے جابر اور متکبر انسانوں کے دِماغ دُرست کرنے کے لئے پیدا کی ہے، تم اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دِکھادیا کہ تم اتنے عاجز ہو کہ اگر ایک مکھی تمہیں ستانا چاہے تو تمہارے اندر اتنی بھی طاقت نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اس کی تکلیف سے بچالو۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کسی نہ کسی مصلحت اور حکمت کے تحت پیدا کی ہے۔

ایک بچھو کا عجیب واقعہ..... اِمام رازی رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور بزرگ اور علمِ کلام کے

ماہر گزرے ہیں، جنھوں نے ''تفسیر کبیر'' کے نام سے قرآنِ کریم کی مشہور تفسیر لکھی ہے، اس تفسیر میں صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر دوسو صفحات پر مشتمل ہے، اور اس تفسیر میں سورۂ فاتحہ کی پہلی آیت: ''الحمدللہ رب العٰلمین'' کی تفسیر کے تحت ایک واقعہ لکھا ہے کہ میں نے ایک بزرگ سے خود ان کا اپنا واقعہ سنا ہے، وہ بغداد میں رہتے تھے، وہ بزرگ فرماتے ہیں کہ: ایک شام کو سیر کرنے کے لئے دریائے دجلہ کے کنارے کی طرف چلا گیا، جب میں دریائے دجلہ کے کنارے کنارے چلنے لگا تو میں نے دیکھا کہ میرے آگے ایک بچھو چلا جارہا ہے، میرے دِل میں خیال آیا کہ یہ بچھو بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کسی نہ کسی مصلحت کے تحت ہی پیدا کیا ہے، اب اس وقت پتہ نہیں کہاں سے آرہا ہے؟ کہاں جارہا ہے؟ اس کی منزل کیا ہے؟ وہاں جاکر کیا کرے گا؟ میرے دِل میں خیال آیا کہ میرے پاس تو وقت ہے، میں سیر کے لئے نکلا ہوں، آج میں اس بچھو کا تعاقب کرتا ہوں کہ یہ کہاں جاتا ہے؟ چنانچہ وہ بچھو آگے آگے چلتا رہا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا، چلتے چلتے اس نے پھر دریا کی طرف رُخ کیا اور کنارے پر جاکر کھڑا ہوگیا، میں بھی قریب ہی کھڑا ہوگیا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ دریا میں ایک کچھوا تیرتا ہوا آرہا ہے، وہ کچھوا آکر کنارے لگ گیا اور یہ بچھو چھلانگ لگا کر اس کی پشت پر سوار ہوگیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے دریا عبور کرنے کے لئے کشتی بھیج دی، چنانچہ وہ کچھوا اس کو اپنی پیٹ پر سوار کرکے روانہ ہوگیا، چونکہ میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ آج میں یہ دیکھوں گا کہ بچھو کہاں جارہا ہے؟ اس لئے میں نے بھی کشتی کرائے پر لی اور اس کے پیچھے روانہ ہوگیا، حتیٰ کہ اس کچھوے نے دریا پار کیا اور جاکر اسی طرح دُوسرے کنارے لگ گیا، اور وہ بچھو چھلانگ لگا کر اُتر گیا، اب بچھو آگے چلا اور میں نے اس کا پھر تعاقب کرنا شروع کردیا۔

آگے میں نے دیکھا کہ ایک آدمی درخت کے نیچے سو رہا ہے، میرے دِل میں خیال آیا کہ شاید بچھو اس آدمی کو کاٹنے جارہا ہے، میں نے سوچا کہ میں جلدی سے اس آدمی کو بیدار کردوں تاکہ وہ شخص اس بچھو سے بچ جائے، لیکن جب میں اس آدمی کے قریب گیا تو میں نے

دیکھا کہ ایک زہریلا سانپ اپنا پھن اُٹھائے اس آدمی کے سر کے پاس کھڑا ہے اور قریب ہے کہ وہ سانپ اس کو ڈس لے، اتنے میں بچھو تیزی کے ساتھ سانپ کے اُوپر سوار ہو گیا اور اس کو ایک ایسا ڈنک مارا کہ وہ سانپ بل کھا کر زمین پر گر پڑا اور تڑپنے لگا، پھر وہ بچھو وہاں سے کسی اور منزل پر روانہ ہو گیا۔ اچناک اس وقت سونے والے شخص کی آنکھ کھل گئی اور اس نے دیکھا کہ قریب سے ایک بچھو جا رہا ہے، اس نے فوراً ایک پتھر اُٹھایا اور اس بچھو کو مارنے کے لئے دوڑا، میں قریب ہی کھڑا ہوا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، اس لئے میں نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے کہا کہ تم جس بچھو کو مارنے جا رہے ہو یہ تمہارا محسن ہے اور اس نے تمہاری جان بچائی ہے، حقیقت میں یہ سانپ جو یہاں مرا پڑا ہوا ہے تم پر حملہ کرنے والا تھا، اور قریب تھا کہ تمہیں ڈس لیتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے بہت دُور سے اس بچھو کو تمہاری جان بچانے کے لئے بھیجا ہے اور اب تم اسی بچھو کو مارنے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہ بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے اس روز اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا یہ کرشمہ دیکھا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اس بچھو کو دریا کے دُوسرے کنارے سے اس شخص کی جان بچانے کے لئے یہاں لائے۔ بہر حال دُنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے پیدا کرنے میں کوئی نہ کوئی تکوینی حکمت اور مصلحت نہ ہو۔ (اصلاحی خطبات، ج:۵، ص:۱۵۹،۱۶۰)

علاماتِ قیامت..... حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب میری اُمت میں چودہ خصلتیں پیدا ہوں تو اس پر مصیبتیں نازل ہونا شروع ہو جائیں گی۔ دریافت کیا گیا: یارسول اللہ! وہ کیا ہیں؟ فرمایا:

- ..... جب سرکاری مال ذاتی ملکیت بنالیا جائے۔
- ..... امانت کو مالِ غنیمت سمجھا جائے۔
- ..... زکوٰۃ جرمانہ محسوس ہونے لگے۔
- ..... شوہر بیوی کا مطیع ہو جائے۔

- .....بیٹا ماں کا نافرمان بن جائے۔
- .....آدمی دوستوں سے بھلائی کرے اور باپ پر ظلم ڈھائے۔
- .....مساجد میں شور مچایا جائے۔
- .....قوم کا رذیل ترین آدمی اس کا لیڈر ہو۔
- .....آدمی کی عزّت اس کی بُرائی کے ڈر سے ہونے لگے۔
- .....نشہ آور اشیاء کھلم کھلا استعمال کی جائیں۔
- .....مرد آبریشم پہنیں۔
- .....آلاتِ موسیقی کو اِختیار کیا جائے۔
- .....رقص وسرود کی محفلیں سجائی جائیں۔
- .....اس وقت کے لوگ اگلوں پر لعن طعن کرنے لگیں۔

تو لوگوں کو چاہئے کہ پھر وہ وقت عذابِ اِلٰہی کے منتظر رہیں خواہ سرخ آندھی کی شکل میں آئے یا زلزلے کی شکل میں، یا اَصحابِ سبت کی طرح صورتیں مسخ ہونے کی شکل میں۔ (ترمذی، باب علامات الساعۃ)

پانچ ہزار کتابوں کا نچوڑ.....ایک بزرگ کا قول ہے کہ میں نے پچاس سال میں پانچ ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا اور ان میں سے صرف پانچ باتوں کو عمل کے لئے منتخب کیا۔

① .....اے نفس! اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے پر راضی رہ، ورنہ کوئی دُوسرا مالک تلاش کر جو اس سے زیادہ دینے والا ہو۔

② .....اے نفس! جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، ان سے بچ، ورنہ اللہ کے ملک سے باہر چلا جا۔

③ .....اے نفس! اگر تو گناہ کرنا چاہے تو کوئی ایسی جگہ تلاش کر جہاں خدا تعالیٰ نہ دیکھے، ورنہ گناہ مت کر۔

④ .....اے نفس! تو اپنے پروردگار کی عبادت کرتا رہ، ورنہ اس کا دیا ہوا رزق مت کھا۔

⑤.....اے نفس! خلقِ خدا کے ساتھ خوش خلقی اور ہمدردی سے پیش آ، ورنہ اپنی زبان بند رکھ اور کسی کے ساتھ تعلق نہ رکھ۔

موجودہ دور میں ایک خطرناک چیز..... دِل کی بیماریوں میں سب سے اہم نفاق ہے، جس کی بنیاد عبداللہ بن اُبی بن سلول کے ہاتھ رکھی گئی تھی، جو اس قافلے کا سالار تھا، یہ وبا بلا روک ٹوک بڑھتی جارہی ہے، بالخصوص ان کے دِلوں میں جو اپنے آپ کو بہت صاف ستھرا اور نفاق سے بہت دُور سمجھتے ہیں، حالانکہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسے عظیم المرتبت صحابی اور خلیفۂ وقت اس سے ڈرتے رہتے تھے اور اللہ کی قسم! دِلا کر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہا سے پوچھتے تھے کہ کہیں مجھے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین میں سے تو نہیں شمار کیا ہے؟ وہ جواب دیتے: نہیں! اور ابن ابی ملیکہؒ جو بڑے جلیل القدر تابعی تھے، فرماتے ہیں: ''میں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تیس صحابہ سے ملاقات کی ہے، ان میں سے ہر ایک خود اپنے متعلق نفاق کا اندیشہ محسوس کرتا تھا۔'' جب ان کا یہ حال تھا، تو ہم اپنے بارے میں کیا کہیں؟

(الفرقان، ۲۰۰۱ء)

صحابہ رضی اللہ عنہم کی زیارت..... اِمام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول بکثرت نقل کیا جاتا ہے، جس کا مدعا ومفہوم یہ ہے کہ محدثین میں سے کسی شخص کو دیکھنے کا اکثر موقع ملتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی زیارت کرلی، اس لئے کہ حدیث وسنت کے انتہائی اہم فریضے کو ادا کرنے میں یہ بھی ان کے مثل ہیں۔ (سیر اعلام النبلاء، ج:۱۰، ص:۶۰)

حدیث کا ایک عجیب مضمون..... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ ارشاد فرماتے تھے: خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندے کی توبہ سے اُس مسافر آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو (اثنائے سفر میں) کسی ایسی غیر آباد اور سنسان زمین پر اُتر گیا ہو جو سامانِ حیات سے خالی اور اسبابِ ہلاکت سے بھرپور ہو، اور اس کے ساتھ بس اس کی سواری کی اُونٹنی ہو، اُسی پر اُس کے کھانے پینے کا سامان ہو، پھر وہ (آرام کرنے کے لئے) سر رکھ کے لیٹ جائے، پھر اُسے

نیند آجائے، پھر اس کی آنکھ کھلے تو دیکھے کہ اس کی اُونٹنی (پورے سامان سمیت) غائب ہے، پھر وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہو، یہاں تک کہ گرمی اور پیاس وغیرہ کی شدّت سے جب اس کی جان پر بن آئے تو وہ سوچنے لگے کہ (میرے لئے اب یہی بہتر ہے کہ) میں اُسی جگہ جاکر پڑ جاؤں (جہاں سویا تھا) یہاں تک کہ مجھے موت آجائے، پھر وہ (اسی ارادے سے وہاں آکر) اپنے بازو سر پر رکھ کے مرنے کے لئے لیٹ جائے، پھر اس کی آنکھ کھلے تو وہ دیکھے کہ اس کی اُونٹنی اس کے پاس موجود ہے اور اس کے پاس کھانے پینے کا پورا سامان (جوں کا توں محفوظ) ہے، تو جتنا خوش یہ مسافر اپنی اُونٹنی کے ملنے سے ہوگا، خدا کی قسم! مؤمن بندے کے توبہ کرنے سے خدا اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے۔ (صحیح بخاری ومسلم)

تشریح..... ذرا تصوّر کیجئے اس بدو مسافر کا جو اکیلا اپنی اُونٹنی پر سوار ہوکر اور راستے بھر کے لئے کھانے پینے کا سامان اُسی پر لاد کر دُور دراز کے سفر پر کسی ایسے راستے سے چلا جس میں کہیں دانہ پانی ملنے کی اُمید نہیں، پھر اثنائے سر میں وہ کسی دن دوپہر میں کہیں سایہ دیکھ کر اُترا اور آرام کرنے کے ارادے سے لیٹ گیا، اُس تھکے ماندے مسافر کی آنکھ لگ گئی، کچھ دیر کے بعد جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اُونٹنی اپنے سارے ساز وسامان کے ساتھ غائب ہے، وہ بیچارہ حیران وسراسیمہ ہوکر اُس کی تلاش میں دوڑا بھاگا، یہاں تک کہ گرمی اور پیاس کی شدّت نے اس کو لبِ دَم کردیا، اب اس نے سوچا کہ شاید میری موت اسی طرح اس جنگل بیان میں لکھی تھی، اور اب بھوک پیاس میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے یہاں مرنا ہی میرے لئے مقدر ہے، اس لئے وہ اسی سایہ کی جگہ میں مرنے کے لئے آکے پڑ گیا اور موت کا انتظار کرنے لگا، اسی حالت میں اس کی آنکھ پھر جھپکی، اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اُونٹنی اپنے پورے ساز وسامان کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی ہے۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ بھاگی ہوئی اور گم شدہ اُونٹنی کو اس طرح اپنے پاس کھڑا دیکھ کے اُس بدو کو جو مایوس ہوکر مرنے کے لئے پڑ گیا تھا، کس قدر خوشی ہوگی۔ صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیثِ پاک میں قسم کھا کے فرمایا کہ: خدا کی قسم! بندہ جب جرم وگناہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رُجوع کرتا اور سچے دِل سے توبہ

کر کے اس کی طرف آتا ہے تو اس رحیم و کریم رَبّ کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی کہ اس بدو کو اپنی بھاگی ہوئی اُونٹنی کے ملنے سے ہوگی۔

قریب قریب یہی مضمون صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ کے علاوہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی مروی ہے، اور صحیح مسلم میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ، حضرت نعمان بن بشیر اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مضمون مروی ہے، بلکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس بدو مسافر کی فرطِ مسرّت کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: اُونٹنی کے اس طرح مل جانے سے وہ اتنا خوش ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اس بے انتہا عنایت اور بندہ نوازی کے اعتراف کے طور پر وہ کہنا چاہتا تھا کہ: ''اَللّٰھُمَّ أَنْتَ رَبِّیْ وَأَنَا عَبْدُکَ'' (خداوندا! بس تو ہی میرا رَبّ ہے اور میں تیرا بندہ ہوں) لیکن خوشی کی سرمستی میں اس کی زبان بہک گئی اور اُس نے کہا: ''اَللّٰھُمَّ أَنْتَ عَبْدِیْ وَأَنَا رَبُّکَ'' (میرے اللہ! بس تو میرا بندہ اور میں تیرا خدا)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی اس غلطی کی معذرت کرتے ہوئے فرمایا: ''أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرْحِ'' (فرطِ مسرّت اور بے حد خوشی کی وجہ سے اُس بیچارے بدو کی زبان بہک گئی۔)

بلاشبہ اس حدیث میں توبہ کرنے والے گناہگاروں کو اللہ تعالیٰ کی جس خوشنودی کی بشارت سنائی گئی ہے، وہ جنت اور اس کی ساری نعمتوں سے بھی فائق ہے۔

شیخ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''مدارج السالکین'' میں توبہ و اِستغفار ہی کے بیان میں اسی حدیث پر کلام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اس خوشنودی کی وضاحت میں ایک عجیب و غریب مضمون لکھا ہے، جس کو پڑھ کر ایمانی رُوح وجد میں آجاتی ہے، ذیل میں اس کا صرف حاصل وخلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کی ہوئی ساری کائنات میں انسان کو خاص شرف بخشا ہے، دُنیا کی ساری چیزیں اس کے لئے پیدا کی گئی ہیں، اور اس کو اپنی معرفت اور اطاعت وعبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے، ساری مخلوقات کو اُس کے لئے مسخر کیا،

اور اپنے فرشتوں تک کو اس کا خادم اور محافظ بنایا، پھر اس کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کتابیں نازل فرمائیں اور نبوّت و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا، پھر ان ہی میں سے کسی کو اپنا خلیل بنایا، اور کسی کو شرفِ ہم کلامی بخشا، اور بہت بڑی تعداد کو اپنی ولایت اور قربِ خصوصی کی دولت سے نوازا۔ اور انسانوں ہی کے لئے دراصل جنت و دوزخ کو بنایا۔ الغرض دُنیا و آخرت میں اور عالم خلق و اَمر میں جو کچھ ہے اور ہوگا، اُس سب کا اصل مرکز و محور بنی نوعِ انسان ہی ہے، اُسی نے امانت کا بوجھ اُٹھایا، اُسی کے لئے شریعت کا نزول ہوا، اور ثواب و عذاب دراصل اسی کے لئے ہے، پس اس پورے کارخانۂ عالم میں انسان ہی اصل مقصود ہے، اللہ نے اس کو اپنے خاص دستِ قدرت سے بنایا، اس میں اپنی رُوح ڈالی، اپنے فرشتوں سے اس کو سجدہ کرایا، اور اِبلیس اس کو سجدہ ہی نہ کرنے کے جرم میں مردودِ بارگاہ ہوا اور اللہ نے اس کو اپنا دُشمن قرار دیا۔ یہ سب اس لئے کہ اُس خالق نے انسان ہی میں اس کی صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ایک زمینی اور مادّی مخلوق ہونے کے باوجود اپنے خالق و پروردگار کی (جو وراء الوراء اور غیب الغیب ہے) اعلیٰ درجے کی معرفت حاصل کرے، ممکن حد تک اس کے اسرار اور اس کی حکمتوں سے آشنا ہو، اس سے محبت اور اس کی اطاعت کرے، اس کے لئے اپنے نفسانی مرغوبات اور اپنی ہر چیز کو قربان کرے، اور اس دُنیا میں اس کی خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرے، اور پھر اس کی خاص الخاص عنایتوں اور بے حساب بخششوں کا مستحق ہو کر اس کی رحمت و رأفت، اس کے پیار و محبت اور اس کے بے انتہا لطف و کرم کا مورد بنے۔ اور چونکہ وہ رَبّ کریم اپنی ذات سے رحیم ہے اور لطف و کرم اس کی ذاتی صفت ہے (جس طرح بلاتشبیہ ''مامتا'' ماں کی ذاتی صفت ہے) اس لئے اپنے وفادار اور نیک کردار بندوں کو اِنعامات و احسانات سے نوازنا اور اپنے عطیات سے ان کی جھولیوں کو بھر دینا اُس کے

لئے بلاتشبیہ اسی طرح بے انتہا خوشی کا باعث ہوتا ہے جس طرح اپنے بچے کو دُودھ پلانا اور نہلا دُھلا کر اچھے کپڑے پہنانا مامتا والی ماں کے لئے انتہائی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ اب اگر بندے نے بدبختی سے اپنے اُس خالق و پروردگار کی وفاداری اور فرمانبرداری کا راستہ چھوڑ کے بغاوت و نافرمانی کا طریقہ اختیار کرلیا اور اس کے دُشمن اور باغی شیطان کے لشکر اور اس کے متبعین میں شامل ہوگیا اور رَبِّ کریم کی ذاتی صفت رحمت و رأفت اور لطف و کرم کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے بجائے وہ اُس کے قہر و غضب کو بھڑکانے لگا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں (بلاتشبیہ) اُس غصّے اور ناراضی کی سی کیفیت پیدا ہوگی جو نالائق اور ناخلف بیٹے کی نافرمانی اور بدکرداری دیکھ کر مامتا والی ماں کے دِل میں پیدا ہو جاتی ہے، پھر اگر اُس بندے کو کبھی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ محسوس کرے کہ میں نے اپنے مالک و پروردگار کو ناراض کر کے اپنے کو اور اپنے مستقبل کو برباد کرلیا اور اُس کے دامنِ رحم و کرم کے سوا میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے، پھر وہ اپنے کئے پر نادم و پشیمان ہو اور مغفرت و رحمت کا سائل بن کر اُس کی بارگاہِ کرم کی طرف رُجوع کرے، سچے دِل سے توبہ کرے، روئے اور گڑگڑائے اور معافی مانگے اور آئندہ کے لئے وفاداری اور فرمانبرداری کا عہد و ارادہ کرلے تو سمجھا جاسکتا ہے کہ اس کے اس کریم رَبّ کو جس کی ذاتی صفت رحمت و رأفت اور جس کا پیار ماں کے پیار سے بھی ہزاروں گنا زیادہ ہے، اور جو بندوں پر نعمتوں کی بارش برسا کے اتنا خوش ہوتا ہے جتنا نعمتوں کو پا کر محتاج بندے خوش نہیں ہوتے، تو سمجھا جاسکتا ہے کہ ایسے کریم پروردگار کو اپنے اس بندے کی اس توبہ و انابت سے کتنی خوشی ہوگی۔''

شیخ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے بہت زیادہ وضاحت اور بسط کے ساتھ یہ مضمون لکھنے کے بعد آخر میں کسی عارف کا ایک واقعہ لکھا ہے جو شیطان یا نفسِ اَمارہ کے اغواء سے غلط

راستے پر پڑ گئے تھے اور سرکشی و نافرمانی کے جراثیم ان کی رُوح میں پیدا ہونے لگے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''وہ عارف ایک گلی سے گزر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک گھر کا دروازہ کھلا اور ایک بچہ روتا چلاّتا ہوا اُس میں سے نکلا، اس کی ماں اس کو گھر سے دھکے دے دے کر نکال رہی تھی، جب وہ دروازے سے باہر ہو گیا تو ماں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا، بچہ اسی طرح روتا چلاّتا بکتا بڑبڑاتا کچھ دُور تک گیا، پھر ایک جگہ پہنچ کر کھڑا ہو گیا، اور سوچنے لگا کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر کے سوا کہاں جا سکتا ہوں؟ اور کون مجھے اپنے پاس رکھ سکتا ہے؟ یہ سوچ کر ٹوٹے دِل کے ساتھ وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ پڑا، دروازے پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے، تو وہ بیچارہ وہیں چوکھٹ پر سر رکھ کے پڑ گیا اور اسی حالت میں سو گیا، ماں آئی، اُس نے دروازہ کھولا اور اپنے بچے کو اس طرح چوکھٹ پر سر رکھ کے پڑا دیکھ کے اس کا دِل بھر آیا اور مامتا کا جذبہ اُبھر آیا، اس کی آنکھوں سے آنسوں بہنے لگے، بچے کو اُٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کو پیار کرنے لگی، اور کہہ رہی تھی: بیٹے! تو نے دیکھا تیرے لئے میرے سوا کون ہے؟ تو نے نالائقی، نادانی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے اور میرا دِل دُکھا کے مجھے وہ غصہ دِلایا جو تیرے لئے میری فطرت نہیں ہے، میری فطرت اور مامتا کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں تجھ پر پیار کروں اور تجھے راحت و آرام پہنچانے کی کوشش کروں، تیرے لئے ہر خیر اور بھلائی چاہوں، میرے پاس جو کچھ ہے تیرے ہی لئے ہے۔ اُن عارف نے یہ سارا ماجرا دیکھا اور اس میں اُن کے لئے جو سبق تھا وہ لیا۔''

اس قصے پر غور کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سامنے رکھئے: ''للّٰہُ أرحَمُ لِعِبادِہٖ من ھٰذِہٖ بِولدھَا'' (خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنے بندوں کے لئے

اس سے زیادہ پیار اور رحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچے کے لئے ہے)۔ یہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیث کا ٹکڑا ہے، ایک عورت تھی جو بڑے والہانہ انداز میں اپنے بچے کو بار بار اُٹھا کے سینے سے لگاتی اور دُودھ پلاتی تھی، دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ مامتا کے جذبے سے اس کا سینہ بھرا ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا: ''خدا کی قسم! اللہ کی ذات میں اپنے بندوں کے لئے اُس سے زیادہ پیار اور ترحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچے کے لئے ہے۔''

کیسے بد بخت اور محروم ہیں وہ بندے جنھوں نے نافرمانی کی راہ اپنا کے ایسے رحیم و کریم پروردگار کی رحمت سے اپنے کو محروم کر لیا ہے اور اس کے قہر و غضب کو بھڑکا رہے ہیں، حالانکہ توبہ کا دروازہ اُن کے لئے کھلا ہوا ہے، اور وہ اُس کی طرف قدم بڑھا کے اللہ تعالیٰ کا وہ پیار حاصل کر سکتے ہیں جس کے سامنے ماں کا پیار کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حقائق کا فہم اور یقین نصیب فرمائے۔

يَا غَفَّارُ اغْفِرْ لِيْ يَا تَوَّابُ تُبْ عَلَيَّ يَا رَحْمٰنُ ارْحَمْنِيْ يَا رَئُوْفُ ارْؤُفْ بِيْ يَا عَفُوُّ اعْفُ عَنِّيْ يَا رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتِكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَطَوِّقْنِيْ حُسْنَ عِبَادَتِكَ.

کمال شیخ بوعلی سینا و کرامت ولی..... منقول ہے کہ ایک ولی نے شیخ سے کہا کہ: تو نے علومِ عقلیہ میں اپنی ساری عمر گنوادی، آخر کس مرتبے تک پہنچا؟ شیخ نے کہا: ساعاتِ یومیہ میں سے مجھے ایک ایسی گھڑی معلوم ہے کہ اس میں لوہا مثلِ خمیر ہو جاتا ہے، ولی نے کہا کہ: جب وہ گھڑی آئے تو مجھے بتانا۔ چنانچہ شیخ نے وہ گھڑی بتائی اور ہاتھ میں لوہا لے کر اس میں اُنگلی داخل کی تو وہ اس کے اندر دھنس گئی، گھڑی گزر جانے پر ولی نے شیخ سے کہا کہ: اب پھر اسی طرح کرو، شیخ نے کہا: وہ گھڑی گزر چکی، اب ممکن نہیں۔ ولی نے لوہا ہاتھ میں لے کر اُنگلی داخل کر دی اور فرمایا کہ: دانش مند کے لئے یہ زیبا نہیں کہ وہ اپنی عمر زائل و فانی چیز میں صَرف کرے۔ (احوال مصنفین، ص ۳۹۱)

علمِ دِین کی قدر وعظمت کا ایک واقعہ.....محمد بن مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ جو مشائخِ بلخ سے ہیں، انہوں نے اپنے بیٹے کو تعلیمِ فقہ کے لئے بغداد بھیجا اور اس کی تعلیم پر چالیس ہزار روپے خرچ کئے، فارغ ہوکر آیا تو پوچھا: کیا پڑھ کر آئے؟ عرض کیا: صرف ایک مسئلہ سیکھا ہے کہ عورت کا حیض دس دن پر ختم ہوتو مدتِ غسل زمانۂ طہارت میں شمار ہوگی، یعنی اگر نماز کے وقت میں اتنا وقت مل گیا کہ تحریمہ کہہ سکتی ہے خواہ غسل نہ کر سکے تو اس وقت کی نماز اس کے ذمے واجب ہوگی، اور اگر کم مدت پر انقطاع دمِ حیض ہوا تو وقتِ غسل حیض میں شمار ہوگا، غسل کا وقت بھی گزرے اور اس کے بعد تحریمہ کا وقت بھی پالے گی تو نماز اس کے ذمے ہوگی ورنہ نہیں۔

والد موصوف نے یہ سن کر فرمایا: واللہ! تم نے میری رقم ضائع نہیں کی، اور وہ سب بجا طور پر صَرف ہوگئی۔ یہ تھی پہلے زمانے میں علم کی قدردانی کہ ایک مسئلہ سیکھنے پر ہزاروں روپے قربان کر دیتے تھے۔ (انوار الباری، ج:۸، ص:۱۶۳، نقل از حاشیہ بحر الرائق)

علوِّ سند کے لئے میر سیّد شریف کا طویل سفر کا ایک دِلچسپ واقعہ.....میر سیّد شریف کو شوق ہوا کہ شرح مطالع خود مصنف سے پڑھنی چاہئے، چنانچہ ان کے پاس پہنچ گئے، وہ اس قدر ضعیف تھے کہ پلکوں کو اُٹھا کر دیکھا اور پوچھا: کون ہے؟ کہنے لگے: میرا نام سیّد شریف ہے، میں اگرچہ شرح مطالع پڑھ چکا ہوں لیکن صرف اس تمنا سے کہ آپ سے پڑھوں آیا ہوں، جواب دیا کہ: میں بالکل ضعیف ہوں، تم جوان ہو، مجھ سے تمہاری تسکین نہ ہو سکے گی، لہٰذا میرا ایک شاگرد رُوم میں ہے جس کا نام مبارک شاہ ہے، اس سے پڑھنا میرا پڑھانا ہے۔

سیّد شریف نے وہاں پہنچ کر سارا قصہ بیان کیا، انہوں نے کہا: ہمارے داخلے کی ایک شرط ہے، ایک اشرفی یومیہ ایک سبق کے لئے لیتا ہوں۔ اب سیّد شریف کہاں سے لاتے؟ کہتے ہیں: میں نے سوچنے کے بعد کہا کہ: ایک بات عرض کرتا ہوں، روزانہ کی شرط نہیں، جب میرے پاس اشرفی ہوگی سبق پڑھ لوں گا۔ کہنے لگے: منظور ہے! میر صاحب نے فیصلہ کیا کہ جھولی ڈال کر بھیک مانگوں گا، جب اشرفی پوری ہو جائے گی سبق پڑھ لوں گا، مگر نوبت نہیں آئی تھی کہ ایک رئیس کو معلوم ہوگیا، اس نے بلا کر کہا کہ: ایک اشرفی یومیہ میں تمہیں دُوں گا، سبق

پڑھنا شروع کردو، انہوں نے شروع کردیا، ایک ہفتہ اس حالت میں گزرا تو ایک روز اُستاد نے بلاکر کہا: میاں! ہمیں اس کی کچھ پروانہیں، ہمارا دعویٰ تو صرف جانچنا تھا، امتحان لینا تھا، وہ ہو چکا، اور اپنی اشرفی اپنے پاس رکھو اور اب تم باقاعدہ سبق میں بیٹھا کرو۔ مگر پھر دُوسرا امتحان یوں ہوا کہ اگلی صف میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، پیچھے بیٹھتے تھے، بولنے کی اجازت بھی نہ تھی، آخر سیّد تھے، تفتازانی کو شکست دی تھی، دِل میں جوش اُٹھتا تھا، شکوک وشبہات لگتے تھے، مگر خاموش ہونا پڑتا تھا، کیونکہ اجازت نہ تھی، مگر ان کا دستور یوں تھا کہ حجرے میں دیوار کو مخاطب کر کے کہا کرتے تھے کہ صاحبِ کتاب نے یوں کہا ہے اور اُستاد نے یوں کہا، مگر میں یوں کہتا ہوں، ایک روز اُستاد گشت کرنے کے لئے نکلے، جب ان کے حجرے کے قریب آئے تو آوازیں سن کر کھڑے ہو گئے، جب سیّد شریف نے کہا، خوب غور سے سنا، بات بہت عمدہ تھی، بہت پسند آئی اور صبح آ کر پوچھا: فلاں حجرے میں کون رہتا ہے؟ بتایا گیا سیّد شریف، بلایا گیا اور کہا: تم اگلی صف میں بیٹھو اور جی کھول کر پوچھو، پھر ان کا جو رُتبہ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ میں کہتا ہوں ایک معمولی شرح مطالع کے لئے اتنی مصیبتیں برداشت کیں تو حدیثِ نبوی کے لئے جس قدر بھی سفر اور اس کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑی ہوں تو کیا بعید ہے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اور بہت سی مثالیں ہیں، عبداللہ بن عدی رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث سماعت کرنے کے لئے مدینہ سے عراق تک کا سفر کیا جو تقریباً ایک ماہ کی مسافت ہے، ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے عضیہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث کے لئے مدینہ سے مصر تک کا سفر کیا جو ایک ماہ کی مسافت ہے۔ (فیض الباری شرح البخاری)

کلمۃ خالدۃ..... ایک آدمی نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ: میری ایک بیٹی ہے، اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں، کیسے آدمی سے کروں؟ فرمایا: کسی اللہ سے ڈرنے والے سے، اگر پسند نہ بھی آئی تو اس پر (متقی ہونے کی وجہ سے) ظلم نہیں کرے گا۔

لوہے کو لوہا کاٹتا ہے..... حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ جب کبھی طویل سفر پر جاتے تو کسی

اکھڑ مزاج، درشت خو آدمی کو بھی ساتھ رکھتے، تو آپ سے عرض کیا گیا کہ: ایسے آدمیوں کو ساتھ رکھنا تو آپ کی ثقاہت کے خلاف ہے۔ فرمایا: تمہیں معلوم نہیں کہ شر کا صحیح دفاع شر ہی سے ہوتا ہے۔ (فتح القدیر، ج:٦، ص:٣٧٤)

لطیفہ عجیبہ..... کہتے ہیں کہ محی السنہ امام غزالی رحمہ اللہ مفتی الثقلین تھے، ایک روز انہوں نے جنات سے حوادثات کی بابت دریافت کیا، جنات نے کہا کہ علامہ زمخشری قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہیں اور نصف کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے تفسیر منگوائی اور پوری نقل کروا کر اصل نسخہ جنات کے ذریعے واپس کرا دیا۔ جب امام زمخشری موصوف کے یہاں آئے تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے زمخشری کو کتاب دِکھائی، زمخشری کتاب دیکھ کر حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ اگر میں یہ کہوں کہ کتاب میری ہے تو یہاں کیسے آئی؟ جبکہ میں نے اس کو اس طرح محفوظ رکھا تھا کہ کسی کو اس کی اطلاع بھی نہیں دی، اور اگر یہ کہوں کہ کسی دُوسرے کی ہے تو لفظاً، معنیً، وضعاً، ترتیباً اتنا کثیر توارد عقلاً محال ہے، زمخشری کی اس حیرت کو دیکھ کر امام غزالی رحمہ اللہ نے کہا کہ: یہ تمہاری ہی کتاب ہے، میں نے جنات کے ذریعے منگوالی ہے۔ زمخشری جنات کے قائل نہ تھے، لیکن اس مجلس میں قائل ہو گئے۔ (احوال مصنفین، ص:٤١٩)

پاکباز عاشق..... جمیل مشہور عاشق گزرے ہیں، یہ بُثینہ نامی عورت پر عاشق تھا، دونوں کا تعلق عرب کے مشہور قبیلے عذراء سے تھا، جس کا خمیر ہی عشق و محبت پر اُٹھایا گیا تھا، ''لیلیٰ و مجنون'' کی طرح ان کا نام بھی ساتھ لیا جاتا ہے۔

علامہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان (جلد اوّل، ص:٣٧٠) میں جمیل کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ عباس بن سہل ساعدی اُن کے مرضِ وفات میں عیادت کے لئے حاضر ہوئے، جمیل نے ان سے کہا کہ:

''یَا ابْنَ سَهْلٍ! مَا تَقُوْلُ فِیْ رَجُلٍ لَمْ یَشْرَبِ الْخَمْرَ قَطُّ، وَلَمْ یَزْنِ، وَلَمْ یَقْتُلِ النَّفْسَ، وَلَمْ یَسْرِقْ، یَشْهَدُ أَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ؟''

ترجمہ: ''یعنی ایسے آدمی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جس نے نہ کبھی شراب پی

ہو، نہ زنا کیا ہو، اور نہ ہی کسی کو قتل کیا ہو، اور نہ چوری کی ہو اور وہ کلمۂ توحید کی گواہی دیتا ہو۔''

عباس بن سہل نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ ایسا آدمی صاحبِ نجات ہے، اور میں اس کے لئے جنت کی اُمید رکھتا ہوں، لیکن ایسا آدمی کون ہے؟ جمیل نے کہا: ''میں ہوں'' تو عباس بولے: آپ کے پاک دامن رہ جانے کے متعلق تو مجھے یقین نہیں آتا، کیونکہ آپ تو بیس سال سے بُثینہ کے بارے میں تشبیب کے اشعار کہہ رہے ہیں، تو اس پر جمیل نے جواب دیا:

''لَا نَالَتْنِیْ شَفَاعَةُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاِنِّیْ لَفِیْ أَوَّلِ یَوْمٍ مِّنْ أَیَّامِ الْآخِرَةِ، وَآخِرِ یَوْمٍ مِّنْ أَیَّامِ الدُّنْیَا، اِنْ کُنْتُ وَضَعْتُ یَدِیْ عَلَیْهَا لِرِیْبَةٍ.''

''آج جبکہ میرا آخرت کی زندگی کا پہلا دن اور دُنیوی زندگی کا آخری دن ہے، میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب نہ ہو اگر میں نے بُثینہ پر گناہ کے خیال سے ہاتھ رکھا ہو۔''

اس کے کچھ دیر کے بعد ان کا انتقال ہو گیا، بُثینہ کو وفات کی خبر ہوئی تو بے ہوش ہو کر گری اور ہوش میں آنے کے بعد یہ دو شعر کہے:

وَاِنْ سُلُوِّیَ عَنْ جَمِیْلٍ لَسَاعَةٍ
مِنَ الدَّهْرِ مَا حَانَتْ وَلَا حَانَ حِیْنُهَا
سَوَاءٌ عَلَیْنَا یَا جَمِیْلَ بْنَ مَعْمَرٍ
اِذَا مُتَّ بِأَسَاءِ الْحَیَاةِ وَلِیْنِهَا

جمیل کی وفات ۹۲ھ میں ہوئی، عباس العقاد نے ''جمیل بُثینہ'' کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے، جو چھپ چکی ہے۔ (توضیح الدرّاسہ شرح حماسہ، ص: ۱۸۹)

مکھی کے بارے میں ایک عجیب حدیث..... بخاری کی ایک حدیث ہے کہ جب پینے کی چیز میں مکھی گر جائے تو اس میں ڈبو دیا جائے، پھر نکال دیا جائے، کیونکہ اس کے ایک

پَر میں بیماری ہے اور دُوسرے میں شفاء ہے۔

علامہ خطابی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض نادانوں نے اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے اعتراض کیا ہے کہ مکھیوں کے بازوؤں میں بیماری اور شفاء کیسے ہوسکتی ہے؟ اور مکھی کو کس طرح اس کا پتہ چلتا ہے کہ بیماری والے بازو کو مقدم اور شفاء والے کو مؤخر کرتی ہے؟ مناسب بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ایک جانور کے دو جزوں میں بیماری اور شفاء کا انکار نہیں کرنا چاہئے اور غور کرنا چاہئے کہ جس اللہ نے شہد کی مکھی کو اس کا مشورہ دیا کہ وہ ایک عجیب الصنعت گھر بنائے اور اس میں شہد جمع کرے، اور جس ذات نے مکھی کو اس بات کا مشورہ دیا کہ وہ اپنی روزی حاصل کرے اور ضرورت کے وقت اس کو جمع کرے، اُسی ذات نے مکھی کو پیدا کیا اور اس کو اس بات کا شعور بھی دیا کہ وہ ایک بازو کو مقدم کرے اور دُوسرے کو مؤخر کرے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی حکیمانہ توجیہات.....شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ: بہت سے دُوسرے حشرات الارض کی طرح مکھی میں بھی ایسا مادّہ ہوتا ہے جس سے بیماری پیدا ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جانور کی فطرت اور طبیعت میں یہ بات رکھی ہے کہ اس کے اندر جو خراب اور زہریلے مادّے پیدا ہوتے ہیں طبیعتِ مدبرہ ان کو خارجی اعضاء کی طرف پھینک دیتی ہے، اس لئے بالکل قرین قیاس ہے کہ مکھی کے اندر کی طرح کے فاسد مادّے کو اس کی طبیعت اس کے بازو کی طرف پھینک دیتی ہو، کیونکہ وہی اس کا خارجی عضو ہے، اور دونوں بازوؤں میں سے بھی خاص اس بازو کی طرف پھینکتی ہو جو نسبتاً کمزور اور کم کام دینے والا ہو (جس طرح ہمارے داہنے ہاتھ کے مقابلے میں بایاں ہاتھ) اور ہر جانور کی یہ بھی فطرت ہے کہ جب اس کو کوئی خطرہ پیش آئے تو وہ زیادہ کام آنے والے اور اعلیٰ واشرف عضو کو اس سے بچانے کی کوشش کرے، اس لئے یہ بھی قرین قیاس ہے کہ مکھی جب گرے تو اس بازو کو بچانے کی کوشش کرے جو خراب مادّے سے محفوظ اور نسبتاً اشرف ہو۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم اُصولِ حکمت کے مطابق ہے، بلکہ دراصل آپ کی اس ہدایت کا تعلق دیگر بہت سی ہدایات کی طرح تحفظِ صحت کے باب سے ہے، لہٰذا کہا

جاسکتا ہے کہ یہ عمل کوئی فرض یا واجب نہیں ہے جس پر عمل نہ کرنا معصیت کی بات ہو، بلکہ یہ ایک طرح کی طبّی رہنمائی ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ ملخصاً)

مکھی کے بارے میں کچھ اضافی معلومات..... اُڑنے والے جانوروں میں کوئی جانور بجز مکھی کے ایسا نہیں جو کھانے پینے کی چیزوں میں منہ ڈال دیتا ہو، افلاطون کا قول ہے کہ مکھی حریص ترین جانور ہے، مکھی کی پلکیں نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس کا حلقۂ چشم بہت چھوٹا ہوتا ہے، پلکوں کا کام یہ ہے کہ وہ آنکھوں کی پتلی کو گرد وغبار سے محفوظ رکھتی ہیں، لہٰذا اس کے عوض اللہ نے مکھی کو دو ہاتھ دیئے ہیں جس سے یہ ہر وقت اپنی آنکھوں کے آئینے کو صاف کرتی رہتی ہے۔ انسانوں کے قریب رہنے والی مکھیاں کبھی نر و مادہ کی جفتی سے پیدا ہوتی ہیں اور کبھی عفونت اور اجسام سے پیدا ہوتی ہیں۔

مسند ابو یعلیٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''مکھی کی عمر چالیس راتیں ہیں، اور تمام مکھیاں دوزخ میں ہوں گی سوائے شہد کی مکھی کے۔'' محدثین حضرات فرماتے ہیں کہ مکھیوں کا دوزخ میں دُخول ان کو عذاب دینے کے لئے نہیں ہوگا بلکہ ان کو اہلِ دوزخ کے لئے عذاب بنا کر مسلط کر دیا جائے گا تا کہ یہ اہلِ جہنم کو اَذیت پہنچائیں۔ (فتح الباری، ج:۱۰،ص:۲۵۰)

ایک عجیب کتاب..... چوتھی صدی کے بہت بڑے عالم شیخ ابو اسماعیل انصاری ہروی تفسیر کے اِمام تھے، بڑے پایہ کے محدث بھی تھے، ہرات کے رہنے والے تھے، ان کے تقریباً ایک لاکھ مرید تھے، آپ رحمۃ اللہ علیہ نے میدانِ تصنیف میں بھی بڑا کام کیا، آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں ایک کتاب ''منزال السائرین بمعانی ایاک نعبد وایاک نستعین'' بھی ہے، جس کی شرح علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے تین مجلدات میں ''مدارج السالکین'' کے نام سے لکھی ہے، اس کتاب میں عبادت کی تمام قسموں کا تفصیلاً ذکر ہے، حدیث میں جو عبادت کی ستر شاخوں کا ذکر آیا ہے ان سب کی توضیح اور تشریح آپ کو اس کتاب میں ملے گی، کمال یہ ہے کہ یہ کتاب صرف دو جملوں ''ایاک نعبد وایاک نستعین'' کی تفسیر ہے۔ (نیل السائرین فی طبقات المفسرین،ص:۱۰۳)

بدعات سے نفرت میں حد کر دی..... اِمام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ: اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ ۲۵ سال تک جماعت میں شریک نہ رہے ''مخافۃ ان یری البدعۃ'' اس اندیشے کی وجہ سے کہ کہیں بدعت کرتے ہوئے لوگ سامنے ہوں گے اور میں انہیں روکنے کی قدرت نہیں رکھوں گا۔ (تذکرۃ الحفاظ)

عرب کی تاریخ اور ان کی رُسومات جاننے کے لئے دو کتابیں..... دورِ جاہلیت میں عرب کی تہذیب وثقافت اور زندگی کے نشیب وفراز میں ان کی مختلف رُسومات کا ایک وسیع باب ہے، تقریباً سال بھر کے ہر مہینے میں ان کی مخصوص رُسومات ہوا کرتی تھیں، خوشی، غمی، نئے سال کے شروع ہونے، بچے کے پیدا ہونے، بیماری میں مبتلا ہونے اور صحت مند ہونے، غرضیکہ ہر معاملے میں ان کی الگ الگ رُسومات تھیں جن کی وہ پابندی کرتے تھے۔ ہمارے معاشرے میں بھی تقریباً یہی رُسومات زندگی کے تمام شعبوں میں منتقل ہوگئی ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اسلام اور دِین ان بے جا رُسومات کی پابندیوں سے منع کرتا ہے۔ کس حد تک ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی رُسومات دورِ جاہلیت کی رُسومات سے مشابہت رکھتی ہیں؟ اس بات کو جاننے کے لئے دو کتابوں ''بلوغ الفرق فی احوال العرب'' اور ''کتاب الاغانی'' کے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

وسیلے کی زیادہ تشریح کس نے کی؟..... جاہل لوگ کسی نبی، ولی اور بزرگ کو مدد کے لئے پکارتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم تو ان کا وسیلہ پکڑتے ہیں، حالانکہ اس مشرکانہ عمل کا اس وسیلے سے جو قرآنِ کریم کی سورۂ مائدہ: ۳۵ اور سورۂ بنی اسرائیل: ۵۶ میں ذکر ہے، کوئی تعلق نہیں، کسی بھی مفسر نے وسیلے کا یہ معنی نہیں کیا ہے، وسیلے کی پوری تحقیق کو جاننے کے لئے آپ علامہ آلوسیؒ کی تفسیر ''رُوح المعانی'' مطالعہ کریں، جس نے سب سے زیادہ اس مسئلے کی وضاحت کی ہے۔

شانِ اِبراہیم علیہ السلام..... راہِ حق میں سیّدنا ابراہیم علیہ السلام نے کتنی تکالیف اور مشکلات اُٹھائی ہیں، اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں پیارے

بیٹے کی قربانی دینے کا اشارہ فرمایا تو اس کے لئے تیار ہو گئے، اللہ کے دِین کے لئے آگ میں ڈالے گئے، اللہ کے حکم پر شام کی طرف ہجرت کی۔ علامہ ابوحیان اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر بحرالمحیط میں اس کا کیسا زبردست نقشہ کھینچا ہے:

"العاشر هی ما ابتلاه فی ماله وولده ونفسه فسلم ماله للضيفان وولده للقربان ونفسه للنيران وقلبه للرحمٰن فاتخذه الله خليلًا." (بحر المحيط، ج:۱،ص:۳۷۵)

نمرود نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا، اس کے بعد سات سال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ تقریر کی جو سورۂ انعام میں: "اذ قال ابراهيم لأبيه آزر" سے شروع ہے، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں، چاند اور سورج کے حدوث اور زوال پر دلیل پیش کی ہے، مولانا رُوم رحمۃ اللہ نے اسی لئے تو فرمایا۔

اندریں وادی مرو تو بے دلیل
لا احب الآفلین گو چوں خلیل

"طبقات ابن سعد" کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس تقریر کے بعد نمرود نے دوبارہ آپ کو تکلیف دیتے ہوئے جیل میں ڈالا، سات سال تک حضرت ابراہیم علیہ السلام جیل میں رہے، وہاں سے رہائی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہ تقریر کی جو سورۂ انبیاء میں: "اذ قال لأبيه وقومه ما هٰذه التماثيل التی أنتم لها عاكفون" سے شروع ہے، جس میں آپ نے ان سب مورتیوں کا، جو قومِ ابراہیم نے اپنے معبودوں کی بنا رکھی تھی، عجز اور بے دلیل ہونا ثابت کیا۔ مؤرّخین نے لکھا ہے کہ نمرود اس زمانے میں تمام دُنیا کا حکمران تھا، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ آزر کا بھی بہت اُونچا مقام تھا، اگر یوں کہا جائے کہ نمرود آزار کا ماتحت تھا تو بھی دُرست ہے، کیونکہ نمرود کے پاس کل دُنیا کا خراج (ٹیکس) جمع ہوتا تھا، اس میں دسواں حصہ آزر کا ہوتا تھا، نمرود اپنے دفتر میں شاہی فرمان سر پر تاج رکھے بغیر جاری نہیں کر سکتا تھا اور نمرود کے سر پر یہ تاج پوشی صرف آزر اپنی مرضی سے کرتا تھا، نمرود کو

اپنے سر پر تاج رکھنے کی نہ خود جرأت تھی اور نہ ہی کوئی دُوسرا آدمی اس کے سر پر تاج رکھ سکتا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام جب آزر کے سامنے صدائے حق بلند کر رہے تھے اس وقت لوگوں نے آزر کی خدمت کے لئے چار سولڑکیاں نذر کی تھیں، یہ لڑکیاں روز صبح جا کر آزر کے دربار میں اپنے سر کے بالوں سے جھاڑو دیتی تھیں۔ آزر کی قوم جو بھی بت بتا دیتی یہ بت مقبول ہوتا، جب اس پر آزر اپنا ہاتھ پھیر دیتا۔ آزر کی اس وجاہت وعزت کے عالم میں ابراہیم علیہ السلام نے ہمت اور شجاعت سے کام لے کر شرک کی جڑ کاٹتے ہوئے باپ کے سامنے توحید کا علم بلند کیا، باپ نے سن کر منّت سماجت کی کہ بیٹا جو بات تم کہہ رہے ہو یہ تو میری عزت واقتدار ختم کر ڈالے گی، اور آخر ابراہیم علیہ السلام سے بیزاری کا اعلان کیا، یہ وہ تمام آزمائشیں ہیں جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام گزارے گئے اور ہر آزمائش میں کامیاب رہے۔ (طبقات ابن سعد، کتبِ تاریخ)

ایک ہی آیت میں تکمیلِ انسان کی چار صفات..... تہذیب الاخلاق (جن کتابوں میں تکمیلِ انسان کی عادات کا تذکرہ ہو) کے موضوع پر کافی علماء نے کام کیا ہے، جلال الدین دوانی کی کتاب ''اخلاق جلالی''، اِمام غزالی کی کتاب ''احیاء العلوم''، تاج کبریٰ زادہ کی کتاب ''مفتاح السعادۃ'' (فقط تیسری جلد)، کتاب ''تہذیب الاخلاق'' اور صاحبِ قاموس کی کتاب اس موضوع پر اچھی کتابیں ہیں، ان سب کتب میں یہ بات قدرے مشترک ہے کہ انسانِ کامل بننے کے لئے درج ذیل چار صفات کی ضرورت ہے:

① .....عفت، پاک دامنی ② .....حلم وبُردباری

③ .....شجاعت وبہادری ④ .....علم ودانش

''تہذیب الاخلاق'' کے موضوع پر لکھی ہوئی مندرجہ بالا کتب میں تکمیلِ انسان کی یہ چار صفات آپ کو شاید یکجا مرتب نہ ملیں، مگر قربان جایئے قرآنِ کریم پر کہ سورۂ اعراف کی ایک ہی آیت میں ان سب کو سمیٹا، ارشاد ہے کہ:

''قل انما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها وما بطن والاثم والبغی

بغیر الحق وان تشرکوا باللہ ما لم ینزل به سلطانًا وان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون." ......ترجمہ: "تو کہہ دے کہ میرے رَبّ نے حرام کیا ہے صرف بے حیائی کی باتوں کو جو ان میں کھلی ہوئی ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں، اور گناہ کو، اور ناحق کی زیادتی کو، اور اس بات کو کہ شریک کرو اللہ کا ایسی چیز کو کہ جس کی اس نے سند نہیں اُتاری اور اس بات کو کہ لگاؤ اللہ کے ذمے وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں۔"

اب حاصل یہ ہے کہ چار باتوں سے اجتناب کرو، جس کے نتیجے میں چار خصلتوں سے مزین ہو کر کامل انسان بن جاؤ گے، فواحش اور بے حیائی کی باتوں سے گریز کرو، نتیجتًا باعفت بن جاؤ گے، ظلم و بربریت کا ارتکاب مت کرو، نتیجتًا حلم و بُردباری نصیب ہوگی، شرک سے نفرت کرو نتیجتًا شجاع اور بہادر بن جاؤ گے، کیونکہ مشرک بزدل ہوتا ہے، موحد کی نظر اللہ پر ہوتی ہے، جاہل مت بنو اور بے ڈھنگی بات سے پرہیز کرو، نتیجتًا علم و دانش سے مالا مال ہو جاؤ گے۔ (افادت شیخ محمد طاہر رحمہ اللہ)

اشرف ہی اشرف...... آسمانی کتابوں کے نزول کا مقصد، لوگوں کی ہدایت و رہنمائی ہے، اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب وہ کتاب اس زبان میں ہو جس کو وہ سمجھ سکیں، اس لئے ہر آسمانی کتاب اسی قومی زبان میں نازل ہوئی جس قوم کی ہدایت کے لئے وہ اُتاری گئی تھی، قرآنِ کریم کے مخاطبِ اوّل چونکہ عرب تھے اس لئے قرآن بھی عربی زبان میں نازل ہوا، عربی زبان اپنی فصاحت و بلاغت اور اعجاز اور ادائے معانی کے لحاظ سے دُنیا کی بہترین زبان ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"أُنزل أشرف الکتب بأشرف اللغات علی أشرف الرسل بسفارہ أشرف الملائکة و کان ذٰلک فی أشرف بقاع الأرض وابتداء انزالہ فی أشرف شھور السنة وھو رمضان فکمل من کل الوجوہ." ...... ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے اس اشرف الکتب (قرآنِ کریم) کو

اشرف اللغات (عربی) میں، اشرف الرسل (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر، اشرف الملائکہ (جبرائیل علیہ السلام) کے ذریعے سے نازل فرمایا، اور مکہ جہاں اس کا آغاز ہوا، دُنیا کا اشرف ترین مقام ہے، اور جس مہینے میں اس کے نزول کی ابتداء ہوئی وہ بھی اشرف ترین مہینہ رمضان ہے۔'' (تفسیر عثمانی)

حدیث: ''أوّل من قاس ابلیس'' کا صحیح مطلب..... دارمی کی حدیث ہے: ''أوّل من قاس ابلیس'' اب لامذہب (اہل حدیث) نے یہاں سے غلط استدلال کر کے اَحناف وغیرہ پر لعن طعن کا سلسلہ شروع کیا کہ دیکھئے قیاس کی ابتداء شیطان سے ہوئی، اس لئے یہ کیونکر دلیل بن سکتا ہے؟ حالانکہ یہ ایک غلط پروپیگنڈا ہے، کیونکہ اَحناف تو ضعیف حدیث تک کو بھی قیاس پر مقدم کرتے ہیں، چہ جائیکہ مرفوع اور قوی حدیث ہو، چنانچہ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''وأصحاب أبی حنیفة رحمه الله مجمعون علٰی أن مذهب أبی حنیفة أن ضعیف الحدیث عنده أولٰی من القیاس والرأی وعلٰی ذٰلک بنی مذهبه.'' (اعلام الموقعین، ج:۱،ص:۷۷)..... ترجمہ: ''حضرت اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کا اس بات پر اجماع ہے کہ اِمام صاحب رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ضعیف حدیث بھی قیاس اور رائے سے اَوْلٰی و بہتر ہے اور اسی پر انہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی۔''

جہاں تک تعلق ہے حدیث دارمی کا، تو اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ''أوّل من قاس (فی مقابلة النص) ابلیس'' نص کے مقابلے میں قیاس کو اختیار کرنا کارِ اِبلیس ہے۔ ''والأحناف کثر الله سوادهم مبرؤن عن ذٰلک'' چنانچہ اَحناف کی مشہور اُصولِ فقہ کی کتاب ''اُصول الشاشی'' میں یہ بات صراحۃً مذکور ہے کہ جب شارع کا قول اور نص موجود ہو تو اس کے ہوتے ہوئے مجتہد کا قول مردود ہوگا۔

اِمام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور اِمام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفے کے عمیق

مطالعے کے بعد کیا نتیجہ نکالا؟..... اِمام غزالی رحمہ اللہ کی تمام عمر فلسفے کی پیچیدگیوں میں گزری تھی، لیکن عمر کے آخر میں قرآن اور سنت کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے، آپ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے: ''مات الغزالی والبخاری علٰی صدرہ'' کہ موت کے وقت بخاری آپ کے سینے پر پڑی تھی۔ ابن عربی نے لکھا ہے: ''أمرضه الشفاء'' ''شفاء'' نامی کتاب نے آپ کو بیماری میں مبتلا کر دیا، آپ کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ: ''شیخنا الغزالی هناک دخل فی بطن الفلسفة ثم أراد أن یخرج منها فما خرج منها'' ہمارے اُستاد فلسفے میں اس حد تک منہمک تھے کہ جب اس سے نکلنا چاہا تو نہیں نکل سکے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے مجموعۃ الفتاویٰ ج:۱۳ میں اِمام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا درج ذیل قول نقل کیا ہے:

> ''قد تأمّلتُ طرق الکلامیة والمنهاج الفلسفیة فما رأیتها تشفی علیلًا ولا تروی غلیلًا ورأیت أقرب الطرق طریقة القرآن.''..... ترجمہ: ''میں نے فلسفہ اور علمِ کلام کے نہج پر بہت غور کیا، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اس سے کسی بیمار کو شفا ہوتی ہے نہ کسی پیاسے کی تشنگی رفع ہوتی ہے، مجھے تو سب سے عمدہ طریقہ قرآن کا نظر آتا ہے۔''

خلوت کی اہمیت..... باری تعالیٰ سے محبت اور اس کے ذکر و شکر سے لگاؤ، یہ پہلی راہ ہے محبتِ رسول پیدا کرنے کی، اور ہی بھی بڑی کارگر، اس راہ کے راہی کے لئے ضروری ہے کہ وہ لذت آشنائے خلوت ہو، اس لئے کہ یہی وہ حالت ہے جس میں انسان اپنے نفس کو عبادت کے لئے سب سے زیادہ آمادہ پاتا ہے۔

اِمام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے: ''میرا دِل خلوت کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے، اور اس میں سب سے زیادہ راحت محسوس کرتا ہے۔'' (سیر اعلام النبلاء، ج:۱۱، ص:۲۲۶)

اسی بات کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے: ''ان فی الدنیا جنةً من لم یدخلها لم یدخل جنة الآخرة'' یعنی دُنیا میں بھی ایک جنت

(خلوت مع اللہ) ہے، جو اس سے لطف اندوز نہ ہو، وہ آخرت کی جنت سے بھی لطف اندوز نہ ہوگا۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں: ''یہ دُشمن میرا کیا بگاڑ لیں گے کہ میں تو اپنی جنگ اپنے سینے میں لئے پھر رہا ہوں، جدھر کا بھی رُخ کروں وہ میرے ساتھ ہی رہے گی، اگر وہ مجھے قید کر دیں تو میں خلوت کی عظیم نعمت سے لطف اندوز ہوں گا، اگر قتل کر دیں تو جامِ شہادت نوش کروں گا، اور اگر وہ جلاوطن کر دیں تو سیاحت کی سعادت حاصل کروں گا۔'' (صحیح الوابل الصیب لابن قیم رحمۃ اللہ، تحقیق سلیم الہلالی، ص:۹۳)

انہیں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ان کے مایۂ ناز شاگرد حافظ ابن قیمؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ: ''مجھ سے شیخ الاسلام کے بعض اعزہ واقرباء نے یہ ذکر کیا کہ وہ کبھی کبھار اپنے اُوپر ''وارد ہونے والے حالات'' کی سختی کی وجہ سے لوگوں سے الگ تھلگ صحراء میں نکل جاتے ہیں، ایک دن میں بھی آپ کے پیچھے ہولیا، جب آپ صحراء میں پہنچے تو گہرا سانس لیتے ہوئے کسی شاعر کا یہ شعر پڑھنے لگے۔

واخرج من بین البیوت لعلنی

احدث عنک النفس بالسر خالیًا

یعنی اے نفس! میں انسانی بستی سے نکل کر یہاں اس لئے آیا ہوں تا کہ خلوت میں تجھ سے کچھ راز و نیاز کر سکوں۔ (مدارج السالکین، ج:۳، ص:۶۴)

گناہ کرنے سے پہلے سوچ لیں!..... ایک شخص نے حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے عرض کیا کہ: میں نے بہت گناہ کئے ہیں، آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ مجھے نصیحت فرما دیں کہ آئندہ میرا نفس مجھے گناہ پر آمادہ نہ کر سکے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ نے اس کی یہ بات سن کر فرمایا کہ: اگر تم پانچ باتوں پر قدرت حاصل کر لو تو یہ گناہ تمہارے لئے کچھ نقصان دہ نہ ہوں گے۔ یہ سن کر اس شخص نے کہا: وہ پانچ باتیں کیا ہیں؟ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اللہ کی نافرمانی کا ارادہ ہے تو اس کا پیدا کیا ہوا رزق نہ کھاؤ۔ اس آدمی نے کہا: پھر میں کیا کھاؤں جبکہ سارا رزق

اسی کا پیدا کیا ہوا ہے؟ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: خود سوچو! کیا تمہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ جس ذات کا عطا کردہ رِزق کھاؤ، اسی کی نافرمانی کرو؟ اس نے کہا: ہرگز نہیں! اور دُوسری بات کیا ہے؟

حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: اگر اس کی نافرمانی کا ارادہ ہے تو اس کے پیدا کئے ہوئے مقامات میں بھی نہ رہو۔ اس شخص نے عرض کیا کہ: یہ تو پہلی بات سے بھی زیادہ سنگین ہے، آسمان و زمین میں سب کچھ جب اسی کا پیدا کردہ ہے تو پھر میں کہاں رہوں؟ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ تمہیں اچھا لگتا ہے کہ جس کی بنائی ہوئی زمین میں رہو، اسی کی نافرمانی کرو؟ اس نے کہا: ہرگز نہیں! اور تیسری بات کیا ہے؟

حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جب تم اسی کے رزق کو کھانے اور اسی کی زمین پر رہنے پر مجبور ہو تو ایسا کرو کہ کسی ایسے مقام پر جا کر گناہ کیا کرو جہاں وہ تم کو نہ دیکھ سکے۔ اس شخص نے عرض کیا: یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اس سے چھپ جاؤں جبکہ وہ ہر ظاہر و پوشیدہ پر نظر رکھتا ہے؟ حضرت ابراہیمؒ نے پھر اس سے کہا: اے بندۂ خدا! کیا تمہیں یہ گوارا ہے کہ تم اسی کا پیدا کردہ رِزق کھاؤ، اس کی بنائی ہوئی زمین میں رہو، اور پھر اسی کو دِکھا کر گناہ کرو؟ اس نے کہا: ہرگز نہیں! ہرگز نہیں! چوتھی بات کیا ہے؟

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب ملک الموت تمہاری رُوح قبض کرنے آئیں گے تو ان سے کہنا: مجھے بس اتنی مہلت دے دیجئے کہ میں توبہ اور کچھ نیکیاں کرلوں۔ اس نے عرض کیا: وہ ہرگز نہیں مانیں گے! آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب تو اس پر قادر نہیں کہ موت کو تھوڑی دیر کے لئے ٹال کر توبہ کر سکے، تو پھر تو نجات اور خلاصی کی اُمید کیونکر لگائے بیٹھا ہے؟ اس نے کہا: پانچویں بات کیا ہے؟

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جب قیامت کے دن فرشتے تمہیں جہنم میں ڈالنے کو چلیں تو تم ان کے ساتھ مت جانا۔ اس نے عرض کیا: یہ تو ممکن ہی نہیں کہ وہ مجھے چھوڑ دیں! آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: پھر تو نجات کی اُمید کیسے لگائے بیٹھا ہے؟ اس نے عرض کیا: جناب ابراہیم! میں سمجھ گیا، میں سمجھ گیا، میں اللہ سے معافی چاہتا ہوں اور اس کے حضور توبہ کرتا ہوں۔

اس کے بعد وہ شخص عبادت میں ایسا لگا کہ موت کے علاوہ کوئی دُوسری چیز اس کو عبادت سے جدا نہ کرسکی۔ (کتاب التوبۃ، ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ، ص: ۲۸۵، ۲۸۶، بحوالہ ماہنامہ ''الفرقان'' ستمبر ۲۰۰۱ء)

قیمتی کتب خانے کو جدا کرنا گوارا نہیں کیا..... یہ زمانہ تاتار گردی کا زمانہ تھا، سارا عالمِ اسلام ان کی ہیبت سے لرزہ براندام تھا، لیکن عراق و جزیرہ کی سرزمین خاص طور پر ان کی جولانگاہ تھی، ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سات برس کے تھے کہ ان کا وطن حران تاتاری حملے کی زد میں آگیا، تاتاریوں کے حملے کے بعد علم و فضل، عزت و آبرو اور جان و مال کے لئے کوئی پناہ کی جگہ نہ تھی، آخر مجبور ہو کر ان کا خاندان بھی شرفاء و علماء کے صدہا خاندانوں کی طرح کسی اسلامی ملک میں پناہ ڈھونڈنے کے لئے نکل کھڑا ہوا، عراق کی طرف جانے کا کوئی سوال نہ تھا، قریب تر ملک جو اس وقت تک تاتاری غارت گروں سے بچا ہوا تھا، شام تھا، جہاں مصر کے طاقتور مملوک سلاطین حکومت کر رہے تھے، آخر اس خاندان نے مغرب ہی کا رُخ کیا اور دمشق کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس پریشانی اور بے سروسامانی کی حالت میں بھی اس علمی خاندان نے اپنے قیمتی کتب خانے کو جو کئی پشتوں کا اندوختہ اور ایک بڑا علمی سرمایہ تھا، جدا کرنا گوارا نہیں کیا، چنانچہ سب مال و متاع چھوڑ کر کتابیں ایک گاڑی پر بار کیں اور روانہ ہو گئے، تاتاریوں کا کھٹکا لگا ہوا تھا، ہر جگہ دہشت پھیلی ہوئی تھی، عورتوں اور بچوں کا ساتھ تھا، بڑی مشکل یہ تھی کہ جانوروں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کی گاڑی خود کھینچنی پڑتی تھی، قافلہ افتاں و خیزاں چلا جا رہا تھا، ایک جگہ قریب تھا کہ تاتاری سر پر پہنچ جائیں، قباحت یہ ہوئی کہ کتابوں کی گاڑی چلتے چلتے رُک گئی، خاندان کے لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی اور گریہ وزاری کی، اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور گاڑی کے پہیے کام کرنے لگے اور قافلہ آگے بڑھا۔ (الکوکب الدریہ، بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت، ج: ۲)

باقاعدہ مدارس کی ابتداء کب ہوئی؟..... معتضد باللہ کے بعد سے بہرحال تعلیم گاہوں کا انتظام ایک گونہ اجتماعی شکل میں تھا، مگر باقاعدہ مدرسہ کی بناء چوتھی صدی ہجری کے

بعد پڑی، اوراس کی اوّلیت کس سہرا باشندگانِ نیشاپور کے سر ہے، علامہ مقریزی کا بیان ہے:
"ان المدارس مما حدث فی الاسلام ولم تکن تعرف فی زمن الصحابة رضی اللہ عنهم ولا التابعین وانما حدث عملها بعد الأربعمائة من الهجرة وأوّل من حفظ عنه أنه بنی فی الاسلام أهل نیسابور فبنت بها المدرسة البهیقیة" مدارسِ اسلامی ایجادات ہیں، صحابہؓ اور تابعینؒ کے دور میں ان کا وجود معلوم نہیں تھا، چوتھی صدی ہجری کے بعد ان کا وجود ہوا، مدرسہ کے بانی اوّل اہلِ نیشاپور ہیں، جہاں سب سے پہلے مدرسہ بہیقیہ کی بنیاد ڈالی گئی۔

مدارس اور دُوسری ملّی خدمات کے معاوضے کی حد..... جولوگ اوقاف کے نگران ہیں، یا مساجد و مدارس کے منتظم ہیں، یا مسلم حکومتوں کے اداروں کے ذمہ دار ہیں، یا ایسی ہی دُوسری ملکی اور ملّی خدمات جن کا انجام دینا فرضِ کفایہ ہے، ان پر مأمور ہیں، ان حضرات کے لئے بھی اعلیٰ اور افضل یہ ہے کہ اگر اپنے پاس اتنا اثاثہ ہو اور وہ اپنے بچوں کے ضروری اخراجات پورے کر سکتے ہوں تو ان اداروں سے اور حکومت کے بیت المال سے کچھ بھی نہ لیں، لیکن اگر اپنے پاس گزارے کے لئے مال موجود نہ ہو اور کسب کے اوقات ان کاموں میں مشغول ہو جاتے ہوں تو بقدرِ ضرورت ان اداروں سے مال لے لینے کا اختیار ہے، مگر "قدرِ ضرورت" کا لفظ پیشِ نظر رہے، بہت سے لوگ ضابطے کے طور پر کاغذی خانہ پُری کے لئے اپنا ماہانہ کچھ حصہ مقرّر کر لیتے ہیں، لیکن مختلف طریقوں سے اس سے کہیں زیادہ بے احتیاطی کے ساتھ اپنی ذات پر اور بال بچوں پر خرچ کرتے چلے جاتے ہیں، اس بے احتیاطی کا مداوٰی بجز خوفِ الٰہی کے کچھ نہیں۔ (معارف القرآن، ج:۳، ص:۳۰۷)

پختہ مضبوط گھر تعمیر کرنا توکل کے خلاف نہیں..... "ولو کنتم فی بروج مشیدة" اس آیت میں کہا گیا کہ موت تم کو بہر کیف پہنچ کر رہے گی، اگر چہ تم مضبوط محلوں میں ہی کیوں نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ رہنے سہنے اور مال و اسباب کی حفاظت کے لئے مضبوط و عمدہ گھر تعمیر کرنا نہ خلافِ توکل ہے، اور نہ خلافِ شرع ہے۔ (قرطبی)

انسان بے نیاز ہو جائے تو ظلم کرتا ہے.....اللہ تعالیٰ ساری کائنات سے بالکل مستغنی اور بے نیاز ہے، لیکن بے نیازی کے ساتھ وہ رحمت والا بھی ہے، اس لئے قرآن مجید میں "ربک الغنی" کے الفاظ سے رَبّ کی بے نیازی بیان کرنے کے ساتھ "ذو الرحمة" (رحمت والا ہے) کا اضافہ موجود ہے۔ اور یہ اسی ذاتِ پاک کا کمال ہے ورنہ انسان کی عادت یہ ہے کہ اگر وہ دُوسروں سے بے نیاز اور مستغنی ہو جائے تو اس کو دُوسروں کے نفع نقصان اور رنج وراحت کی کوئی پروانہیں رہتی، بلکہ اسی حالت میں وہ دُوسروں پر ظلم و جور کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے، قرآنِ کریم کی ایک آیت میں ارشاد ہے: "ان الانسان لیطغٰی ان رّاٰہ استغنٰی" یعنی انسان جب اپنے آپ کو بے نیاز اور مستغنی پاتا ہے تو وہ سرکشی اور طغیانی پر آمادہ ہو جاتا ہے، اسی لئے حق جل شانہ نے انسان کو ایسی ضروریات میں جکڑ دیا ہے جو دُوسروں کی امداد کے بغیر پوری ہی نہیں ہو سکتی، بڑے سے بڑا بادشاہ اور حاکم نوکروں چاکروں اور چپڑاسیوں کا محتاج ہے، بڑے سے بڑا مال دار اور مل آنر مزدوروں کا محتاج ہے، قدرت نے سب کو محتاجی کی ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، ہر ایک دُوسرے کا محتاج ہے، کسی کا کسی پر احسان نہیں۔ (معارف القرآن، ج:۳،ص:۴۶۱)

حکم زکوٰۃ میں بنیادی بات.....قانونِ زکوٰۃ میں شریعتِ اسلام نے ہر قسم کی زکوٰۃ میں اس بات کو بنیادی اُصول کے طور پر استعمال کیا ہے کہ جس پیداوار میں محنت اور خرچ کم ہے اس میں زکوٰۃ کی مقدار زیادہ، اور جتنی محنت اور خرچ کسی پیداوار پر بڑھتا جاتا ہے اتنی ہی زکوٰۃ کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر کسی کو کوئی قدیم خزانہ مل جائے، یا سونے چاندی وغیرہ کی کان نکل آئے تو اس کا پانچواں حصہ بطور زکوٰۃ کے اس کے ذمے لازم ہے، کیونکہ محنت اور خرچ کم اور پیداوار زیادہ ہے، اس کے بعد بارانی زمین کا نمبر ہے، جس میں محنت اور خرچ کم سے کم ہے، اس کی زکوٰۃ پانچویں حصے سے آدھی یعنی دسواں حصہ کر دیا گیا، اس کے بعد وہ زمین ہے جس کو کنویں سے یا نہری پانی خرید کر اس سے سیراب کیا جاتا ہے، اس میں محنت اور خرچ بڑھ گیا تو زکوٰۃ اس سے بھی آدھی کر دی گئی یعنی بیسواں حصہ، اس کے

بعد عام نقد سونا یا چاندی اور مالِ تجارت ہے، جن کے حاصل کرنے اور بڑھانے پر خرچ بھی کافی ہوتا ہے اور محنت بھی زیادہ، اس لئے اس کی زکوٰۃ اس کی آدھی یعنی چالیسواں حصہ کر دیا گیا۔ (معارف القرآن، ج:۳،ص:۴۷۰)

تفسیر قرآن کا سب سے بڑا مدرسہ..... صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں تفسیر کی تعلیم کی کئی درس گاہیں تھیں:

① ..... مدرسۂ مکہ، جس کے صدر مدرّس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تھے۔

② ..... مدرسۃ المدینہ، جس کے مدرّسین میں علی بن ابی طالب، اُبی بن کعب رضی اللہ عنہما کا نام آتا ہے۔

③ ..... مدرسۂ عراق جس کے بڑے اُستاذ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔

④ ..... مدرسۂ شام جس کے اساتذہ میں حضرت ابو درداء انصاری خزرجی اور تمیم داری رضی اللہ عنہما کے نام شامل ہیں۔

⑤ ..... مدرسۂ مصر جس کے بڑے دو اُستاذ حضرت ابو موسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما تھے۔

لیکن ان تمام مدارسِ تفسیر میں سب سے اہم اور بنیادی ''مدرسۂ مکہ'' تھا، کیونکہ اس کے اُستاذ اور شیخ ترجمان القرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تھے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

''أعلم الناس بالتفسير أهل مكة، لأنهم أصحاب ابن عباس كمجاهد وعطاء بن أبي رباح، وعكرمة مولى ابن عباس وغيرهم من أصحاب ابن عباس كطاؤس، وأبي الشعثاء وسعيد بن جبير وأمثالهم.'' (مقدمہ فی اصول التفسیر، ص:۲۳)..... ترجمہ: ''تفسیر کی بابت سب سے بڑھ کر سمجھنے والے اہلِ مکہ تھے، کیونکہ وہ لوگ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے، جس میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ، عکرمہ رحمۃ اللہ

علیہ، طاؤس رحمۃ اللہ علیہ، ابی الشعثاء رحمۃ اللہ علیہ اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ کے نام شامل ہیں۔"

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے خصوصی دُعا فرمائی ہے: "اللّٰھم فقّھہ فی الدین وعلّمہ التأویل" اے اللہ! ابن عباس کو دِین کی سمجھ اور تفسیر کا علم عطا فرما۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کے عجیب اَشعار..... خاتمۃ المحققین، اِمام المفسرین، اِمام محمود بن عبداللہ آلوسی بغدادی حنفی بغداد ۱۳۰۰ھ کے نابغۂ روزگار شخصیت تھے، آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر "رُوح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی" ایک جامع تفسیر ہے۔ لغت، نحو، ادب اور بلاغت کے علاوہ فقہ، عقائد، کلام، فلسفہ اور ہیئت تصوف اور متعلقہ روایات پر بھی مبسوط بحثیں کی ہیں، روایاتِ حدیث کے معاملے میں بھی علامہ آلوسیؒ علامہ ابن کثیرؒ کی طرح دُوسرے مفسرین کے مقابلے میں محتاط رہے ہیں، اب تفسیر قرآن کے سلسلے میں کوئی بھی کام اس کی مدد سے بے نیاز نہیں ہوسکتا، پندرہ سال علامہ آلوسیؒ نے تفسیر لکھنے میں صَرف کئے، ۱۲۵۲ھ سے تفسیر لکھنے کا آغاز کیا اور ۱۲۶۷ھ میں یہ تفسیر اختتام پذیر ہوئی، تفسیر لکھتے ہوئے آپ رحمۃ اللہ علیہ ساری رات جاگتے رہے، اکثر آپ رحمۃ اللہ علیہ یہ اَشعار پڑھتے تھے:

سھری لتنقیح العلوم ألذ لی
من وصل غانیہ وطیب عناق
وتمایلی طربا لحل عویصۃ أشھی
وأحسن من مدام الساق
وألذ من نقر الفتاۃ لدفھا نقری
لدفع الرمل عن أوراقی

خازن کی وجہ تسمیہ..... خازن کا اصل نام علاء الدین ابوالحسن علی بن محمد ابراہیم الشیحی (حلب کے ایک علاقے کے ایک گاؤں کا نام شیحہ ہے) الشافعی الصوفی ہے، لیکن یہ بزرگ

خازن کے نام سے زیادہ مشہور ہے، کیونکہ یہ دمشق میں خانقاہ سمیساطیہ کی کتابوں کے خازن اور ذمہ دار تھے، ان کی تفسیر کا پورا نام ''لباب التفسیر فی معانی التنزیل'' ہے، انہوں نے اپنی تفسیر میں زیادہ تر پچھلی تفاسیر سے نقل اور انتخاب کیا ہے، یہ کوئی مستقل تفسیر نہیں ہے۔ (الاسرائیلیات والموضوعات)

عیال انسان کی نیکیوں کے لئے گھن ہے..... حقیقت یہ ہے کہ مال اور اولاد کی محبت انسان کے لئے بڑا فتنہ اور آزمائش ہیں، انسان اکثر گناہوں میں خصوصاً حرام کمائی میں انہی کی محبت کی وجہ سے مبتلا ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز بعض اشخاص کو لایا جائے گا، اس کو دیکھ کر لوگ کہیں گے: ''أکل عیالُه حسناتِه'' یعنی اس کی نیکیوں کو اس کے عیال نے کھالیا۔ (رُوح) ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاد کے بارے میں فرمایا: ''مبخلةٌ مجبنةٌ'' یعنی یہ بخل اور جبن یعنی نامردی اور کمزوری کے اسباب ہیں، کہ ان کی محبت کی وجہ سے آدمی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے سے رُکتا ہے، انہی کی محبت کی وجہ سے جہاد میں شرکت سے رہ جاتا ہے۔ بعض سلف صالحین کا قول ہے: ''العیال سوس الطاعات'' یعنی عیال انسان کی نیکیوں کے لئے گھن ہے، جیسا گھن غلہ کو کھا جاتا ہے یہ اس کی نیکیوں کو کھا جاتے ہیں۔ (معارف القرآن، ج:۸، ص:۴۷۰)

تقلید کی حقیقت اور اس کی تفصیل کے لئے معاون کتابیں..... غیر مقلدین نے آج کل تقلید کے خلاف بڑا شور وغوغا شروع کیا ہے، حالانکہ تقلید کی حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اَحکام نہیں جانتے وہ جاننے والوں سے پوچھ کر عمل کریں، اور نہ جاننے والوں پر فرض ہے کہ جاننے والوں کے بتلانے پر عمل کریں، اب یہ ایسی بات ہے کہ قرآن کا واضح حکم بھی ہے اور عقلاً بھی سوا عمل کو عام کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی، اُمت میں عہدِ صحابہؓ سے لے کر آج تک بلا اختلاف اسی ضابطے پر عمل ہوتا آیا ہے، جو تقلید کے منکر ہیں وہ بھی اس تقلید کا انکار نہیں کرسکتے، تقلید کی عالمانہ تحقیقات وتفصیلات اُصولِ فقہ کی کتابوں میں مفصلاً موجود ہیں، درج ذیل کتب اس سلسلے میں بہت مفید ہیں:

① ..... کتاب الموافقات، علامہ شاطبیؒ، جلد رابع باب الاجتہاد۔

② ..... علامہ سیف الدین آمدی کی کتاب اَحکام الاحکام، جلد ثالث، القاعدۃ الثالثۃ فی المجتہدین۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابیں حجۃ اللہ البالغہ اور رسالہ عقد الجید اور آخر میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ''الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد'' مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ کی ''تقلید کی حقیقت''، مولانا محمد سرفراز صفدر کی ''الکلام المفید فی اثبات التقلید''، مولانا محمد تقی عثمانی کی ''تقلید کی شرعی حیثیت''، مفتی سیّد عبدالرحیم لاجپوری کا فتویٰ رحیمیہ جلد چہارم کا مطالعہ اس سلسلے میں مفید ہے۔

دُنیا میں تو سب سے بڑے کافر کی دُعا بھی قبول ہوسکتی ہے ..... اِبلیس نے عین اس وقت جبکہ اس پر عتاب ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ سے ایک دُعا مانگی کہ حشر تک کی زندگی کی مہلت عطا فرمادیجئے، اِبلیس کی یہ دُعا قبول تو ہوئی، لیکن بجائے روزِ قیامت کے ایک خاص مدّت تک کی مہلت دے دی گئی، اس سے پتہ چلا کہ دُنیا میں کافر کی دُعا بھی قبول ہوسکتی ہے، یہاں تک کہ اِبلیس جیسے اَکفر (سب سے بڑے کافر) کی دُعا بھی قبول ہوگئی، مگر آخرت میں کافر کی دُعا قبول نہ ہوگی، جیسے ارشاد ہے کہ: ''وما دُعٰٓؤ الکٰفرین الا فی ضلال''۔ (مختصراز معارف القرآن، ج:۳، ص:۵۲۸)

جھوٹ اور پھر چالاکی بھی ..... رصافہ کی جامع مسجد میں احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک سامنے سے ایک قصہ گو کھڑے ہوکر کہنے لگا کہ:

''حدثنا أحمد بن حنبل ویحییٰ بن معین، قالا: حدثنا عبدالرزاق، عن معمر، عن قتادة، عن أنس قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: من قال: لا الٰه اِلّا الله خلق الله من کل کلمة طیرًا منقاره من ذهب وریشه من مرجان.'' ..... ترجمہ: ''احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کی روایت سے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جس نے ''لا اِلٰہ

اِلَّا اللّٰہ ''پڑھا،تو اللہ پاک ہر کلمے سے ایک پرندہ پیدا کریں گے جس کی چونچ سونے اور پَر مونگ کا ہوگا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک لمبی کہانی شروع کی، اب احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ایک دُوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور ہر ایک نے دُوسرے سے پوچھا کہ: کیا آپ نے اس کو یہ حدیث بیان کی ہے؟ پتہ چلا کہ دونوں میں سے کسی نے بھی اس کے سامنے یہ حدیث بیان نہیں کی، فارغ ہونے کے بعد یحییٰ بن معینؒ نے اس شخص کو بلا کر کہا کہ: ''تم کو یہ حدیث کس نے بیان کی؟'' کہنے لگا: احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے یہ حدیث میرے سامنے بیان کی۔ یحییٰ بن معین نے فرمایا کہ: یحییٰ بن معین تو میں ہوں اور یہ میرے ساتھ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ہے، ہم تو دونوں ہی اس سے بیزار ہیں، پھر تم نے کیونکر ہماری طرف نسبت کی؟ وہ شخص کہنے لگا کہ: میں اس سے قبل یہ سنا کرتا تھا کہ یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل دونوں احمق ہیں، مگر آج اپنی آنکھوں سے میں نے دونوں کی بے وقوفی دیکھی۔ یحییٰ بن معینؒ نے کہا کہ: یہ کس طرح؟ کہنے لگا: ''كأنه ليس في الدنيا أحمد بن حنبل ويحيىٰ بن معين غير كما'' یعنی کیا احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین دُنیا میں تم دونوں کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں؟ میں نے سترہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے احادیث لکھ دی ہیں، اب یہ دونوں بزرگوں خاموشی اختیار کر کے وہاں سے چل دیئے، اگر نہ جاتے تو ممکن تھا کہ ان کے ساتھ شعبی والا قصہ پیش آجاتا، شعبی کا قصہ یہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ ایک مسجد گئے، وہاں بڑی داڑھی والا ایک شخص لوگوں کے سامنے یہ بیان کرتا ہے کہ: ''اللہ نے دو صور پیدا کئے ہیں، اور ہر صور میں دو مرتبہ پھونکنا ہوگا'' نماز سے فارغ ہو کر شعبی نے ایک دم کہا: ''اتق الله يا شيخ!'' بھائی اللہ سے ڈرو! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اللہ نے تو ایک ہی صور پیدا کیا ہے۔ جواب میں اس شخص نے کہا: خاموش ہو جاؤ اے فاجر! یہ بات میں نے فلاں اور فلاں سے سنی ہے، تو کون ہے کہ اس کی تردید کرتا ہے۔ یہ بات کہہ کر اس شخص نے شعبی کو جوتے سے مارنا شروع کر دیا اور اس کی دیکھا دیکھی سب نے اجتماعی طور پر شعبی کو مارنا شروع کر دیا حتیٰ کہ شعبی کو مجبوراً کہنا پڑا کہ بھائی اللہ نے تمیں صور پیدا

کیئے ہیں اور ہر صور میں دو مرتبہ پھونکنا ہوگا، تب ان کی جان محفوظ ہوگئی۔ (الاسرائیلیات و الموضوعات، ص:۹۰)

شیطانی منطقی استدلال اور اس کی تردید..... شیطان نے جب آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے شیطان! سجدہ کرنے سے تجھ کو کونسا امر مانع ہے؟ شیطان کہنے لگا کہ: "خلقتنی من نار" کہ آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا، "وخلقته من طین" اور آدم کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے۔ یہ شیطانی استدلال کا پہلا مقدمہ ہے۔ اور دُوسرا مقدمہ جس کا ذکر نہیں کیا وہ یہ ہے کہ آگ بوجہ نورانی ہونے کے خاک سے افضل ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کی فرع اور اولاد بھی غیر افضل کی فرع سے افضل ہوتی ہے۔ چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کا سجدہ کرنا غیر افضل کو نامناسب ہے۔ ان چاروں مقدمات کو ملا کر شیطان نے اپنے سجدہ نہ کرنے کی یہ دلیل بنائی کہ میں افضل ہوں اس لئے غیر افضل کو سجدہ نہیں کیا۔ مگر پہلے مقدمے کے سوا سارے یہ مقدمات غلط ہیں، اور پہلا مقدمہ بھی عام انسانوں کے حق میں اس معنی سے صحیح ہے کہ انسان کی تخلیق میں جزو غالب مٹی کا ہے، باقی مقدماتِ دلیل کا غلط ہونا کھلا ہوا ہے، کیونکہ آگ کا خاک پر افضل ہونا ایک جزوی فضیلت تو ہوسکتی ہے، کلی طور پر اس کو افضل کہنا دعویٰ بے دلیل ہے، اسی طرح افضل کی فرع اور اولاد کا افضل ہونا بھی مشکوک ہے، ہزاروں واقعات اس کے خلاف سامنے آئے ہیں کہ نیک کی اولاد بد اور بد کی اولاد نیک ہوجاتی ہے، اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ افضل کو مفضول کے لئے سجدہ نامناسب ہے، بعض اوقات مصالح کا تقاضا اس کے خلاف ہونا مشاہد ہے۔ (معارف القرآن، ج:۳،ص:۵۲۶)

اِجتہادی مسائل کو محاذِ جنگ بنانا دُرست نہیں..... دقیق اور اِجتہادی مسائل جن میں قرآن وسنت کے اجمال یا ابہام کی وجہ سے دو رائیں ہوسکتی ہیں، اور اسی بناء پر ان میں فقہائے اُمت کے اقوال مختلف ہیں، وہ اس دائرہ (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) سے خارج ہیں، اَئمہ مجتہدین جن کی شانِ اِجتہاد علمائے اُمت میں مُسلَّم ہے، اگر کسی مسئلے میں ان کے دو

مختلف قول ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی منکر شرعی نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس کی دونوں جانبین معروف میں داخل ہیں، ایسے مسائل میں ایک رائے کو راجح سمجھنے والے کے لئے یہ حق نہیں ہے کہ دُوسرے پر ایسا انکار کرے جیسا کہ گناہ پر کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ وتابعینؒ میں بہت سے اِجتہادی اختلافات اور متضاد اقوال کے باوجود یہ کہیں منقول نہیں کہ وہ ایک دُوسرے پر فاسق یا گنہگار ہونے کا فتویٰ لگاتے ہوں، بحث وتمحیص اور مناظرے ومکالمے سب کچھ ہوتے تھے، اور ہر ایک اپنی رائے کی ترجیح کی وجوہ بیان کرتا اور دُوسرے پر اعتراض کرتا تھا، لیکن کوئی کسی کو اس اختلاف کی وجہ سے گنہگار نہ سمجھتا تھا، اس سے واضح ہوا کہ اِجتہادی مسائل میں جنگ و جدل یا منافرت پھیلانے والے مقالات و مضامین امر بالمعروف وہی عن المنکر میں داخل نہیں۔ (معارف القرآن، ج:۳،ص:۲۵۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کا ہے..... آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ''عامہ اور شاملہ'' ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں سابقہ تمام شریعتیں مدغم ہیں، اس بیان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''بُعثت الی النّاس کافّۃً'' کا صحیح مفہوم بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے، کہ اس حدیث کا مطلب یہ سمجھنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے قیامت تک کے لئے ہے، صحیح نہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ اتنا وسیع ہے کہ آدم علیہ السلام کی نبوت سے پہلے شروع ہوتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ: ''کُنت نبیًّا وآدم بین الروح والجسد'' محشر میں شفاعتِ کبریٰ کے لئے پیش قدمی کرنا اور تمام بنی آدم کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور شبِ معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء کی اِمامت کرانا حضور علیہ السلام کی ایسی سیادتِ عامہ اور اِمامتِ عظمیٰ کے آثار میں سے ہے۔ (معارف القرآن، ج:۲،ص:۱۰۱)

سلام کا فرق..... دُنیا میں باہمی ملاقات کے وقت بطور تحفہ واکرام کے سلام بولا جاتا ہے، اور یہ مسنون بھی ہے، اور یہی سلام موت کے بعد قبروں کی زیارت کے وقت بھی بولا جاتا ہے

اور پھر محشر اور جنت میں بھی بولا جاتا ہے، لیکن آیات اور روایاتِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں تو "السلام علیکم" کہنا مسنون ہے اور اس دُنیا سے گزرنے کے بعد بغیر الف لام کے "سلامٌ علیکم" کا لفظ مسنون ہے، اہلِ اعراف اہلِ جنت کو آواز دے کر کہیں گے: "سلامٌ علیکم"، زیارتِ قبور کے لئے جو کلمہ قرآن مجید میں مذکور ہے وہ بھی "سلامٌ علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار" آیا ہے، اور فرشتے جب اہلِ جنت کا استقبال کریں گے اس وقت بھی یہ لفظ اسی عنوان سے آیا ہے: "سلامٌ علیکم طبتم فادخلوھا خالدین." (معارف القرآن)

بچوں کی جماعت..... کارل مارکس برطانیہ میں اینگلز کے ہاں بھیک مانگتا رہا، سرمایہ دار کے ٹکڑوں پر پل کر سرمایہ داروں کے خلاف نظریہ ایجاد کیا، مگر وہاں آج تک انقلاب نہ آسکا، لیکن ۱۹۱۷ء میں رُوس میں انقلاب آگیا اور اس کے ماننے والے پیدا ہوئے۔ اب اس نظریے کے خلاف جہاں بھی کوئی کام کر رہا ہو وہ اس کو کسی بھی طریقے سے صاف کر دیتے ہیں۔ کارل مارکس کو بُرا کہنے سے اس کے پیروکاروں کو تکلیف ہوتی ہے، اسٹالن کو بُرا کہیں یا لینن کو تو ان کا دِل دُکھتا ہے، اور وہ دوست جو اِشتراکیت کو قبول کرتے ہیں اگر انہیں بُرا کہیں تو ان کی دِل شکنی ہوتی ہے، ان کو ماننے والے ان پر اندھا اعتماد کرتے ہیں، اسٹالن اور لینن نے اپنے ماننے والوں کو "کامریڈ" کہا، یہ پہلی جماعت ہے جس نے کارل مارکس کے نظریے کو برپا کیا اور اسے دُنیا کے "عظیم بچوں" کی جماعت قرار دیا گیا۔ مگر یہی لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی نہیں مانتے، ایک فاؤنڈر، ایک نظریے کے بانی کی حیثیت سے مانتے ہیں، جب اس نظریے کو قبول کرنے والے لوگ پیدا ہوئے تو انہوں نے اس کے لئے قربانیاں دیں، ماریں کھائیں، گھر اور وطن چھوڑا، عزت و آبرو تیاگ دی، بیوی بچے ذبح کرا لئے، اپنی ماؤں بہنوں کی شرم گاہوں پر نیزے مروانے قبول کر لئے، حتیٰ کہ اس نظریے کے ابلاغ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، تب اس نظریے کے خالق اللہ تعالیٰ اور اس کو پیش کرنے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سچا کہا کہ یہ میرے وفادار ہیں۔ اگر کوئی پندرھویں

صدی میں اُٹھ کر یہ کہے کہ میری بیس سال کی ریسرچ کا نچوڑ یہ ہے، میں نے شب و روز مطالعہ کیا، میں نے دُنیا کی لائبریریاں کھنگال ڈالیں اور میں نے ان کتابوں کی سطور کو، اوراق کو اَز بر کرلیا، میں نے ایک ایک دائرے پر نشان لگا دیا ہے، کیا؟ کہ وہ لوگ سچے نہیں تھے، کیا میں اس یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی کو مان لوں؟ اسٹالن اور ابراہیم لنکن کے ماننے والوں کو تو سچا مان لوں، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کو جھوٹا کہوں...؟

جھوٹ کی ایک قسم.....ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک خاتون ایک بچے کو بلا کر گود میں لینا چاہتی تھی، لیکن وہ بچہ قریب نہیں آرہا تھا، ان خاتون نے بچے کو بہلانے کے لئے کہا کہ: ''بیٹا! یہاں آؤ، ہم تمہیں چیز دیں گے'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات سن لی اور آپ نے خاتون سے پوچھا کہ: تمہارا کوئی چیز دینے کا ارادہ ہے یا ویسے ہی اس کو بلانے اور بہلانے کے لئے کہہ رہی ہو؟ اس خاتون نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! میرا کھجور دینے کا ارادہ ہے کہ جب وہ میرے پاس آئے گا تو میں اس کو کھجور دُوں گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر تمہارا کھجور دینے کا ارادہ نہ ہوتا بلکہ محض بہلانے کے لئے کہتیں کہ میں تمہیں کھجور دُوں گی، تو تمہارے نامہ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔

(ابوداؤد، کتاب الادب)

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زمانۂ جاہلیت.....''معانی العرش الیٰ غوانی الفرش'' میں علامہ زبیدی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے:

''مہاجرین وانصار ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع تھے، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: یارسول اللہ! میں نے زمانۂ جاہلیت میں بھی کبھی بتوں کو سجدہ نہیں کیا، ایک مرتبہ میرے والد ہاتھ پکڑ کر مجھے صنم خانے میں لے گئے اور ایک بت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ: یہ تمہارا معبود ہے، اس کو سجدہ کرو، اور یہ کہہ کر مجھے وہاں تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اُس بت کے قریب آیا، اور کہا: میں بھوکا ہوں، مجھے کچھ کھلا، تو اُس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا کہ: میں ننگا ہوں، مجھے کپڑے پہنا، اُس نے اس کا بھی کچھ جواب نہیں دیا۔

پھر میں نے ایک بڑا پتھر اُٹھایا اور کہا کہ: میں یہ پتھر تجھ پر مارتا ہوں، اگر تو خدا ہے تو اپنے آپ کو بچا، اُس نے تب بھی کچھ جواب نہیں دیا، تب میں نے وہ پتھر اُس بت کے سر پر دے مارا، جس سے اُس کا سر ٹکڑے ہو گیا۔ اس کے بعد وہاں میرے والد آ گئے اور یہ منظر دیکھ کہنے لگے کہ: بیٹے! یہ کیا کیا؟ میں نے کہا: وہی کیا جو آپ دیکھ رہے ہیں، تو وہ مجھے میری والدہ کے پاس لے کر گئے اور انہیں سارا واقعہ بتلایا۔ انہوں نے کہا کہ: ان کو کچھ نہ کہیے کہ ان کے بارے میں من جانب اللہ ایک عجیب بات میرے کانوں میں ڈالی گئی ہے۔ میں نے والدہ سے پوچھا کہ: وہ کیا بات ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ: جب تیری ولادت کا وقت قریب آیا تو اُس وقت میرے پاس کوئی نہیں تھا، تو میں نے ایک غیبی آواز سنی جس نے یہ الفاظ کہے:

"یا أمَة الله! علی التحقیق البشری بالولد العتیق، اسمه السماء الصدیق، لمحمد صاحب ورفیق." (أخرجه ابن عساکر بسند صحیح، ص: ۳۸۵).....ترجمہ: "اے خدا کی بندی! تجھے ایک آزاد بیٹے کی خوشخبری دی جاتی ہے، اُس کا نام آسمانوں میں "صدیق" ہے، اور وہ محمدؐ کا ساتھی اور دوست ہوگا۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اس بات کے ختم ہونے کے فوراً بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبریل امین تشریف لائے اور فرمایا کہ: ابو بکر نے جو کچھ کہا ہے وہ سب سچ ہے۔ (ماہنامہ "الخیر" رجب المرجب ۱۴۱۴ھ)

اِختلافِ اَئمہ باعثِ رحمت ہے..... یہاں سے بحث کا ایک اور نقطہ پیدا ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ جب اِجتہاد شرعی چیز ہے جس میں رائے اور فہم کا دخل ہوتا ہے اور آراء بتفاوت افہام متعدد اور مختلف ہو سکتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی اجتہادی مسئلے میں آراء کئی ہو جائیں اور اِجتہادات مختلف رنگوں کے ظاہر ہوں، تو کیا اس اختلافِ رائے کا دروازہ کھلنا اُمت کی تفریق بلکہ تخریب اور تمذیب کا باعث نہ ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ یہ صورتِ اختلاف نہ فی نفسہٖ مضر ہے، نہ دِین کے لئے مضر ہے، نہ اُمت کے لئے مضر ہے، بلکہ علم علماء اور پوری اُمت کے خواص و

عوام کے لئے موجبِ ترقی اور باعثِ سود و بہبود ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں کوئی ترقی بغیر تصادم وتزاحم کے نہیں ہوتی، بلکہ ترقی نام ہی دو متخالف چیزوں کے ٹکرانے کا ہے، اس لئے علم کی وسعت بھی بغیر تزاحمِ آراء اور تصادمِ افکار کے نمایاں نہیں ہوسکتی، ایک حکیم کا مقولہ ہے:

"اَلْقَلْبُ مَیِّتٌ وَّحَیَاتُہٗ بِالْعِلْمِ وَالْعِلْمُ مَیِّتٌ وَّحَیَاتُہٗ بِالْبَحْثِ وَالْمُنَاظَرَۃِ."..... ترجمہ: "دِل آدمی کا مردہ ہے، اُس کی زندگی علم سے ہے، اور علم انسان کا مردہ ہے، اس کی زندگی بحث ومناظرہ سے ہے۔"

ظاہر ہے کہ بحث ومناظرہ علم کو علم سے ٹکرانے کا ہی نام ہے، جس سے علم کے مختلف ومخفی گوشے کھل جاتے ہیں، تکوینِ الٰہی نے اسی لئے اسلام کے مقابلے میں کفر کی طاقتیں کھڑی کیں تاکہ کفر باطل کے جتنے پہلوؤں سے اسلام سے ٹکرائے، اسلام کے اتنے ہی حقانی پہلو نمایاں ہوجائیں اور انجامِ کار حق کا غلبہ سب دیکھ لیں، علم کے مقابلے پر شبہات کا لشکر اسی لئے صف آراء کیا گیا کہ جہل اپنے جس جس حصے سے علم سے ٹکراتا رہے علم کے اتنے ہی مخفی گوشے دُنیا کے سامنے ہوتے رہیں، پھر علم کو علم سے جتنی بھی ٹکر دی جائے معلومات کے اتنے ہی بوقلموں نقشے کھلتے رہیں۔

شریعت نے مشورے کا اُصول اسی لئے رکھا کہ آراء کے تصادم سے مسئلے کے موافق اور مخالف پہلو کھل جائیں اور بات چھن چھنا کر منقح ہوجائے، غرض اگر اُصول کے مقابلے پر اضداد نہ ہوں اور متخالف اشیاء کے سامنے ان کے متخالفات نہ ہوں تو نہ ان کے مخفی حقائق اور قویٰ واشگاف ہوسکتے ہیں اور نہ بے حقیقت اضداد کی قلعی کھل سکتی ہے، اس لئے حق تعالیٰ نے دِین میں ایک حصہ محلِ فکر وبحث رکھ کر اِجتہاد وتحقیق اور تزاحمِ آراء کے لئے چھوڑ دیا، تاکہ اسلام کا وہ باطنی علم جو وسیع ترین کلیات اور مخفی علل واسرار پر مشتمل ہے "لَا تَقِفُ عِنْدَ حَدٍّ" کی حد تک کھلتا چلا جائے اور اُمت کے مخصوص دِماغوں کی جولانیاں اور قلوبِ صافیہ کی رسائیاں سارے عالم کے لئے نفع بخش ثابت ہوں۔

ساتھ ہی اسلامی علوم کی جامعیت اور اسی کے ساتھ کتاب وسنت کی ہمہ گیری بھی کھل

جائے اس کی مختصر مختصر نصوص میں کتنے کتنے علوم بھرے پڑے ہیں کہ ہر مصفّٰی قلب و دِماغ کے لئے اس میں ہر وقت اور وقت کے مناسب علم کا جدید سے جدید سامان تیار ہے جس سے "أُوْتِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ" اور "نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ" کا پورا پورا ظہور ہو جائے۔ ہاں! اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہو جائے کہ کتاب وسنت کے بلیغ جملات اور ذی وجوہ فقرات جس قدر بھی شرعی احتمالات اپنے اندر رکھتے ہیں جو قواعدِ عربیہ اور اُصول لسان کے اعتبار سے ان میں سے حقیقۃً پیدا ہوئے ہیں، وہ تمام محتملات بعض احتمالات میں نہ رہیں، بلکہ ہر ایک محتمل قابلِ عمل اور ایک مستقل اُسوہ بن جائے اور احتمال کی طرف جانے والا چل نکلے اور اسے اپنا مسلک ٹھہرائے تا کہ کلامِ اِلٰہی اور کلامِ رسالت پناہی کا کوئی گوشہ بھی مہمل نہ رہے بلکہ کسی نہ کسی اِمام کے اختیار کر لینے کے سبب وہ اُمت کے زیرِ عمل آجائے، پس آج اختلافِ اَئمہ کی بدولت احادیث کا ہر ہر محمل اجتہادی مسائل کی صورت میں اُمت میں معمول ہے، اور کلامِ پیغمبرؐ کا کوئی گوشہ نہیں ہے جو ایک مستقل مذہب اور مسلک بنا ہوا نہ ہو۔ اسی لئے اس اختلاف کو رحمتِ واسعہ فرمایا گیا کہ اس کی بدولت کلامِ نبوّت کا اعمال ہوتا ہے اہمال نہیں رہتا، وَالْأَعْمَالُ أَوْلٰى مِنَ الْاِهْمَالِ ، نیز اُمت کے لئے اور سہولت بھی بہم پہنچتی ہے کہ ہر مذاق کا طبقہ، ہر مذاق کا اِمام اپنے مناسبِ مذاق علمی پہلو کو لے کر اپنی آخرت سنوار سکتا ہے، اس صورت میں اسلام ایک ایسے دریا کی مانند ہوگا جس کا ایک ہی گھاٹ نہ ہو بلکہ متعدد ہوں کہ جو راہ گیر جس جانب سے بھی گزرے سیراب ہو سکے اور اُسے کسی ایک ہی گھاٹ کی طرف گھوم کر آنے کی مجبوری لاحق نہ ہو کہ ہر گھاٹ پر پانی بھی وہی ہے، مزہ بھی وہی ہے، البتہ سمت اور رُخ بدلا ہوا ہے۔ یا ایک عظیم الشان درخت کے مشابہ ہوگا، جس کی ہزاروں شاخیں ہوں اور ہر سمت میں ہوں تا کہ جدھر سے بھی کوئی آئے، پھر کھا سکے، یہ نہیں کہ شاخ ایک ہی ہے اور ہر جانب سے آنے والے کو ناگزیر طریقے پر ایک ہی سمتِ خاص میں پہنچ کر پھل سے انتفاع کا موقع ملتا ہے۔ یا ایک ایسے عظیم ایوان کی طرح ہے جس میں ہزاروں دروازے ہیں کہ ہر جہت سے آنے والے، ہر سمت سے مکان میں داخل ہو سکتے ہیں اور اس

کے سامان سے راحت اُٹھا سکتے ہیں، جو مجبور نہیں ہیں کہ گھوم پھر کر ایک ہی دروازے سے داخل ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ سہولت اختلافِ اَئمہ ہی کی بدولت اُمت کو حاصل ہو سکتی تھی، اس لئے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اختلافِ اَئمہ اُصول کا نہیں بلکہ اتحادِ اُصول کے ساتھ سمتوں اور جہات و کیفیات کا اختلاف ہے، تاکہ علم کی اس وسعت سے اسلام کی ہمہ گیری اور اُمت کے لئے عمل کی تیسیر ہو جائے، نیز ہر مذاق کے انسان کو، الوانِ فہم کے مذاق کے مطابق مربی اور سامانِ تربیت بھی میسر آ جائے۔

بس اس حکمتِ بالغہ کے ماتحت حق تعالیٰ نے اَئمہ اجتہاد میں تعدد بھی پیدا فرما دیا، اور ان میں متعدد حضرات کے مذاقِ اجتہاد میں الوان کا بھی اختلاف ڈال دیا، اُصولِ استنباط بھی مختلف ہو گئے اور ان کے ماتحت مستنبط شدہ مسائل کی لمیات اور پھر ان لمیات کے ماتحت حکمیات بھی مختلف ہو گئیں اور یہ سارے اختلافات سمٹ کر اس اختلافِ ذوق سے پیدا ہوئے جو اَئمہ کو قدرتِ الٰہی نے تکوینی طور پر بخشا تھا۔ اس کا ایک عظیم فائدہ یہ بھی رُونما ہوا کہ ان اَئمہ کی مختلف شئون سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف اور متنوع شئونِ نبوۃ واشگاف ہوئیں، گویا وہ ساری شئون جو ایک ذاتِ بابرکاتِ نبوی میں مجتمع تھیں اور ان سب کا کوئی ایک اُمتی انفرادی طور پر تحمل نہیں کر سکتا تھا، پوری اُمت کے راسخین فی العلم پر منقسم ہو کر مختلف رنگوں میں ظاہر ہوئیں اور اس شان سے کہ ہر شانِ نبوّت نے ایک ایک مجتہد کے ذریعے ایک مستقل مسلک اور تہذیب کی صورت اختیار کر لی جس پر اُمت کے کروڑوں افراد چلنے کے لئے تیار ہوئے اور شئونِ نبوّت کے یہ تمام الوان بحیثیتِ مجموعی ایک صد رنگ گلدستے کی صورت سے دُنیا میں ظاہر ہوئے۔ نظر بریں فقہائے اُمت کا یہ اختلاف اُمت کے حق میں حق میں نہ صرف غیر مضر بلکہ علماً و عملاً مفید ثابت ہوا، فہیم شخصیات کے مکنون جوہر کھلے، کتاب و سنہ کی بلاغت و جامعیت کے مستور پہلوؤں کا اعلان ہو گیا، اُمت کے لئے عملی آسانیاں بہم پہنچ گئیں، پیغمبر کے متنوع علم کی شئون واضح ہو گئیں، غرض اُمت، پیغمبر، دِین، مذہب سب کے لئے اجتہادی اختلاف اور فروعی تنوع بہر نہج مفید ہی مفید اور رحمت ثابت ہوا، اسی لئے شریعت نے کھلے

الفاظ میں اس اختلاف کی مدح سرائی کرتے ہوئے اسے رحمتِ واسعہ کہا، ارشادِ نبوی ہے:

"اِخْتِلَافُ أَصْحَابِیْ رَحْمَةٌ وَاسِعَةٌ." (رواہ البیھقی فی المدخل عن ابن عباس، ورواہ الدارقطنی والدارمی وابن عساکر عن ابن عمر، وصححہ الحاکم، قاسم العلوم مسئلۂ اِمامت).....ترجمہ: "میرے صحابہ کا اختلاف بڑی رحمت ہے۔"

پھر اسی پر قناعت نہیں فرمائی گئی بلکہ اس پر اَجر وثواب کے مواعید دے کر اُمت کو اس کی رغبت دِلائی گئی، ارشادِ نبوی ہے:

"عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: اِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَاِذَا حَكَمَ ثُمَّ اجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ." (رواہ البخاری، الاقتصاد).....ترجمہ: "عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: جب کوئی حکم کرنے والا حکم کرے اور اِجتہاد میں مصیب ہو، اس کو دو اَجر ملتے ہیں، اور اگر خطا ہو جائے تو اس کو ایک اَجر ملتا ہے۔"

اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی غریب پروری.....جیسے اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ یہ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے، اور یہ نہیں کہ ایک آدھ دُکان تھی کہ کپڑا بکوادیا، جگہ جگہ کپڑے بننے اور سپلائی کرنے کے کارخانے تھے، اور اتنی بڑی دولت تھی کہ جب اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی ہے تو کچھ امانتیں بھی تھیں، مگر چھپن کروڑ روپیہ خزانے کے اندر موجود تھا، جو انہوں نے چھوڑا، مگر ان چھپن کروڑ سے کیا ہوتا؟ یہ سب غریبوں پر خرچ ہوتا تھا۔

ان کی تاریخ میں لکھا ہے کہ کوفہ میں جتنے غریب، بیوائیں اور یتیم تھے، اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں سب کی فہرستیں بنی ہوئی تھیں، اور ان کے قد وقامت نپے ہوئے تھے کہ فلاں اتنی عمر کا ہے، فلاں جوان ہے، فلاں بچہ ہے، غریبوں کے ہر گھر کے لئے رمضان شریف میں کپڑے تیار ہوتے تھے، بڑے آدمی کے بڑے کپڑے، چھوٹے کے چھوٹے کپڑے، عورتوں کے لئے ان کے مناسب، اور جہاں عید کا دن آیا، صبح صبح سب غریبوں کے گھر کپڑے

پہنچ جاتے تھے، تو غریب کہتے تھے کہ ابوحنیفہ سلامت چاہئے، جیسی عید امیروں کی، ویسی عید ہمارے بچوں کی بھی ہے، بہتر سے بہتر کپڑا ملا۔

اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مجلس قائم کی، بڑے بڑے علماء وائمہ اس میں جمع تھے، وہ فقہ کے ہر ہر مسئلے پر بحث کرتے تھے، جس کو آپ آج ''فقہِ حنفی'' کہتے ہیں، یہ بہت سے اِماموں کے دِماغ کا نچوڑ ہے، اِمام محمدؒ، اِمام زفرؒ، اِمام ابو یوسفؒ، بڑے بڑے ائمہ علم و فضل ان کی ایک کمیٹی بیٹھتی، ایک ایک مسئلے پر ایک ایک ایک ہفتہ بحث ہوتی تھی، جب چھن چھنا کر بحث کرنے کے بعد ایک چیز صحیح طور پر واضح ہوتی تھی تب وہ لکھی جاتی تھی، تو بیس جلدوں میں فقہِ حنفی مرتب ہوا، یہ جو سو پچاس کی کمیٹی تھی، ان سب کی تنخواہیں اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے خزانے سے دیتے تھے، کسی کو پانچ سو ماہوار، کسی کو ہزار، یہ لاکھ روپے کا خرچ تھا، جس سے ان حضرات کی خدمت ہوتی تھی، غریبوں کے لئے الگ ہر عید میں سلے سلائے کپڑے موجود ہوتے تھے۔

پھر اس کے ساتھ یہ صورت بھی ہوتی تھی کہ ہزاروں آدمی اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے لاکھوں روپے قرض لے جاتے تھے، ہزاروں کا کام قرض سے چلتا تھا اور اس میں بھی یہ سخاوت کا جذبہ تھا کہ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے بیس ہزار روپے قرض لیا اور مدّت متعین کردی کہ برس دن میں ادا کردُوں گا، مدّت گزر گئی، اس کے پاس کے دینے کو نہ ہوا، یا بخل کیا، نہیں دیا، جب وقت گزر گیا اور نہیں دیا، وہ اب اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کترانے لگا کہ سامنے آؤں گا تو شرمندگی پیدا ہوگی، جب اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ آرہے ہیں اس گلی میں گھس گیا، اس کوچے میں چلا گیا تاکہ سامنا نہ ہو، ورنہ مجھے جھوٹا کریں گے۔

اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ خیال پیدا ہوتو ایک دن آپ رحمۃ اللہ علیہ جارہے تھے، اُدھر سے وہ آرہا تھا، وہ دیکھ کر کترا کر ایک گلی میں گھسا، دوڑ کر اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی گلی میں گھسے اور جا کر پیچھے سے اس کا دامن پکڑا اور کہا کہ:

''بھائی! تو نے تعلقات کیوں خراب کئے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو تم نے بیس ہزار لئے تھے، وہ دینے کو نہیں تھے، اس لئے شرمندہ نہ ہو، میں نے تمہیں معاف کیا، تعلق بڑی چیز ہے، روپیہ بڑی چیز نہیں ہے، تم ایک پائی دینے کی تکلیف مت گوارا کرو، تعلق کو کیوں ختم کیا؟''

ہزاروں کے اس طرح قرضے معاف کر دیئے، دیکھا کہ یہ نہیں دے سکتا، بس اسے معاف کر دیا۔

اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تجارت میں تقویٰ..... پھر اس میں تقوے کا یہ حال تھا کہ، آخر مسلمانوں کے اِمام ہیں، انہوں نے کپڑا بنوا کر سپلائی کیا، کئی لاکھ روپے کا کپڑا اور ایک تاجر کو فروخت کرنے کے لئے بھیجا، انہوں نے دیکھا کہ اس وقت کپڑے کے دام ذرا سستے ہیں اور دو مہینے کے بعد دام چڑھ جائیں گے، کپڑا روک لیا، تاکہ ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول ہوں، چنانچہ یہی ہوا، جب یہ میعاد گزر گئی اب لوگوں کی ضرورت بڑھی تو انہوں نے دام بڑھا دیئے، تو ایک لاکھ کے دو لاکھ وصول کئے اور جا کر بڑی خوشی سے اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رکھے۔

اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: حساب سے تو ایک لاکھ ہونا چاہئے، یہ دو لاکھ کیسے ہو گئے؟

اس نے کہا کہ: میں نے دو مہینے کے لئے کپڑا روک لیا تھا کہ جب ضرورت بڑھ جائے گی، تب فروخت کروں گا۔

فرمایا: معاذ اللہ! اسی کا نام احتکار ہے کہ لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جائے، یہ کہہ کر خفا ہوئے اور فرمایا کہ: یہ دو لاکھ غریبوں کے اُوپر صدقہ کرو، یہ مال میرے کام کا نہیں ہے، اس میں تم نے غریبوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھایا، جب ضرورت کا وقت تھا، تمہیں مقرّرہ قیمت پر بیچنا چاہئے تھا۔ تو کمانے میں یہ تقویٰ تھا اور خرچ کرنے میں یہ سخاوت تھی۔

تو ایسے سخی کے سامنے غرباء کا دِل کیسے ٹوٹ سکتا تھا، ہر غریب کہتا تھا کہ: ابوحنیفہ رحمۃ اللہ

علیہ سلامت چاہئے، میں غریب نہیں ہوں، نہ میرے بیوی بچے اور گھر غریب ہے، کھانے پینے کو آرہا ہے۔ تو اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یوں شکر گزار کہ اللہ نے مجھے توفیق دی، میں نے غریبوں کی خدمت کی، مجھے اَجر ملا، آخرت بنی۔ اور غریب یوں خوش کہ ہماری سرپرستی ہوئی، اس لئے وہ غریب اتنے عاشق تھے کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پسینے پر خون بہانے کے لئے تیار تھے۔

بہرحال اسلام نے خرچ رکھا اور تقسیم رکھی، مگر خوش دِلی کے ساتھ، جبری طور پر نہیں رکھی گئی، جہاں جبر کیا، وہاں ایسی صورتیں رکھی ہیں کہ خرچ کرنا ناگوار نہ ہو، سو پر اڑھائی روپے، اور اڑھائی روپے بھی فوری نہیں، سال بھر کی مدّت رکھی، تاکہ دینے میں کوئی دُشواری نہ ہو، اس طرح سے اسلام نے خرچ کرایا۔

کثرتِ تصنیف مسلمانوں کی خصوصیت ہے..... اِمام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کثرتِ تصنیف بھی اس اُمت کی خصوصیت ہے، دُنیا کی کسی اُمت میں وہ تصانیف نہیں ملیں گی، جو اس اُمت میں ملیں گی، کتب خانے بھر دیئے، ہزار دو ہزار، لاکھ دو لاکھ نہیں، کروڑوں کتابیں آج تک موجود ہیں اور مدّت سے چلی آرہی ہیں۔ مصر کے کتب خانے، اُندلس کے کتب خانے، جب وہاں انقلاب ہوا اور مسلمانوں کی حکومت ختم ہوگئی اور عیسائیوں نے غلبہ پالیا تو تعصب میں آکر یہ چاہا کہ ان کا لٹریچر، ان کا ادب، ان کا سب علمی ذخیرہ دفنا دیا جائے تاکہ ان کا وجود باقی نہ رہے، تو ایک مستقل عملہ اندلس حکومت نے مقرّر کیا کہ مسلمانوں کا لٹریچر ضائع کردیا جائے۔

ایک عورت نے اندلس کی تاریخ لکھی ہے، اس میں وہ لکھتی ہے کہ اندلس کے کتب خانوں کو ضائع کرنے کے لئے ایک مستقل عملہ اندلس حکومت نے مقرّر کیا تاکہ مسلمانوں کا ادب اور علم باقی نہ رہے اور اس پر لاکھوں روپے خرچ ہوئے، مستقل انچارج آفیسر رکھا تو پچاس برس میں جاکر سب کتب خانے ضائع ہوسکے ہیں، تو ایک ایک ملک کے اتنے کتب خانے تھے، یہ مسلمانوں کی تصنیف وتالیف نہیں تھی اور کیا تھا؟

بغداد کے اُوپر تاتاریوں کا جب سیلاب آیا ہے اور خلافت تباہ ہوگئی اور پارہ پارہ ہوگئی، تو بغداد دجلہ کے کنارے پر ہے جو بہت بڑا دریا ہے، پل مسلمانوں نے توڑ دیا تھا، تاتاریوں نے جب بغداد فتح کرلیا تو صرف ایک کتب خانہ مسلمانوں کا لوٹ کر اس کی کتابیں بھر کر دجلے میں سڑک بنائی گئی، بہت چوڑی سڑک بنائی گئی، وہ اتنی چوڑی سڑک تھی کہ چار پانچ گاڑیاں برابر گزر سکتی تھیں، یہ صرف ایک کتب خانے کی کتابیں تھیں، جس سے دجلہ کا پل بنایا گیا۔

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ ان کی سیاہی بہہ کر جو پانی میں گھلی ہے تو ایک مہینے تک علماء کو لکھنے کے لئے روشنائی کی ضرورت نہیں تھی، دجلہ کا پانی روشنائی کا کام دیتا تھا۔ تو جس قوم کے ایک ملک کے ایک شہر کے صرف ایک کتب خانے کا یہ حال ہو، اندازہ کیا جائے کہ بغداد میں کتنے کتب خانے ہوں گے؟ اندلس میں کتنے ہوں گے؟ حجاز میں کتنے ہوں گے؟ مصر میں کتنے ہوں گے؟ خود آپ کے پاکستان میں کتنے کتب خانے ہیں، بہت سے کتب خانے وہ ہیں سندھ وغیرہ میں کہ آج تک ان کو کیڑا چاٹ رہا ہے، کوئی پڑھنے والا لکھنے والا ان کتابوں کو نہیں ہے، ہزاروں کی ہزاروں کتابیں موجود ہیں، ذخیرے ہیں، یہ سب علمائے اسلام کے لکھے ہوئے ہیں، اور یہ سب کی سب کتابیں قرآنِ حکیم کی شرح ہیں، ہر کتاب کے شروع میں کوئی نہ کوئی آیت ہے جس سے مضمون کو شروع کیا گیا ہے۔

عمدہ لباس اور لذیذ کھانا منع نہیں..... پہلی آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو عبادات میں غلو اور خود ایجاد تنگیاں پیدا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں سے پرہیز کرنے اور اپنے اُوپر حرام قرار دینے کو عبادت و طاعت سمجھتے ہیں، جیسے مشرکینِ مکہ اَیامِ حج میں بوقتِ طواف لباس پہننا ہی جائز نہ سمجھتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی حلال اور اچھی غذاؤں سے پرہیز کرنے کو عبادت جانتے تھے۔

ایسے لوگوں کو زجر اور سرزنش کے انداز میں تنبیہ کی گئی کہ اللہ کی زینت یعنی عمدہ لباس جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا فرمایا ہے، اور پاکیزہ عمدہ غذائیں جو اللہ نے عطا فرمائی ہیں ان کو کس نے حرام کیا؟

مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا صرف اس ذاتِ پاک کا حق ہے جس نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے، کسی دُوسرے کی اس میں مداخلت جائز نہیں، اس لئے وہ لوگ قابلِ عتاب و عذاب ہیں جو اللہ کی حلال کی ہوئی عمدہ پوشاک یا پاکیزہ اور لذیذ خوراک کو حرام سمجھیں وسعت ہوتے ہوئے پھٹے حالوں گندہ پراگندہ رہنا نہ کوئی اسلام کی تعلیم ہے، نہ کوئی اسلام میں پسندیدہ چیز ہے، جیسا کہ بہت سے جاہل خیال کرتے ہیں۔

سلف صالحین اور ائمہ اسلام میں بہت سے اکابر جن کو اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت عطا فرمائی تھی، اکثر عمدہ اور بیش قیمت لباس استعمال فرماتے تھے، خواجۂ دو عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی جب وسعت ہوئی عمدہ سے عمدہ لباس بھی زیبِ تن فرمایا ہے، ایک روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک پر ایسی چادر تھی جس کی قیمت ایک ہزار درہم تھی، اِمامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ چار سو گنی کی قیمت کی چادر استعمال فرمائی، اسی طرح حضرت اِمام مالکؒ ہمیشہ نفیس اور عمدہ لباس استعمال فرماتے تھے، ان کے لئے تو کسی صاحب نے سال بھر کے لئے تین سو ساٹھ جوڑوں کا سالانہ انتظام اپنے ذمے لیا ہوا تھا، اور جو جوڑا اِمامؒ کے بدن پر ایک مرتبہ پہنچتا تھا دوبارہ استعمال نہ ہوتا تھا، کیونکہ صرف ایک روز استعمال کر کے کسی غریب طالبِ علم کو دے دیتے تھے۔

وجہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اپنی نعمت اور وسعت عطا فرماویں تو اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتے ہیں کہ اس کی نعمت کا اثر اس کے لباس وغیرہ میں دیکھا جائے، اس لئے کہ اظہارِ نعمت بھی ایک قسم کا شکر ہے، اس کے بالمقابل وسعت ہوتے ہوئے پھٹے پُرانے یا میلے کچیلے کپڑے استعمال کرنا ناشکری ہے۔

ہاں! ضروری بات یہ ہے کہ دو چیزوں سے بچے، ایک رِیا و نمود، دُوسرے فخر و غرور، یعنی محض لوگوں کو دِکھلانے اور اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے لباسِ فاخرہ استعمال نہ کرے، اور ظاہر ہے کہ سلفِ صالحین ان دونوں چیزوں سے بَری تھے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلفِ صالحین میں حضرت فاروقِ اعظمؓ اور بعض دُوسرے صحابہ سے جو عام حالات میں معمولی قسم کا لباس یا پیوند زدہ کپڑے استعمال کرنا منقول ہے، اس کی دو وجہ تھیں، ایک تو یہ کہ اکثر جو کچھ مال آتا وہ فقراء و مساکین اور دِینی کاموں میں خرچ کر ڈالتے تھے، اپنے لئے باقی ہی نہ رہتا تھا، جس سے عمدہ لباس آسکے، دُوسرے یہ کہ آپ مقتدائے خلائق تھے، اس سادہ اور سستی پوشاک کے رکھنے سے دُوسرے اُمراء کو اس کی تلقین کرنا تھا، تاکہ عام غرباء و فقراء پر ان کی مالی حیثیت کا رُعب نہ پڑے۔

اسی طرح صوفیائے کرام جو مبتدیوں کو لباسِ زینت اور عمدہ لذیذ کھانوں سے روکتے ہیں، اس کا منشاء بھی یہ نہیں کہ ان چیزوں کو دائمی طور پر ترک کرنا کوئی کارِ ثواب ہے، بلکہ نفس کی خواہشات پر قابو پانے کے لئے ابتدائے سلوک میں ایسے مجاہدے بطور علاج و دواء کے کردیئے جاتے ہیں، اور جب وہ اس درجے پر پہنچ جائے کہ خواہشاتِ نفسانی پر قابو پالے کہ اس کا نفس اس کو حرام و ناجائز کی طرف نہ کھینچ سکے، تو اس وقت تمام صوفیائے کرام عام سلفِ صالحین کی طرح عمدہ لباس اور لذیذ کھانوں کو استعمال کرتے ہیں، اور اس وقت یہ طیباتِ رزق ان کے لئے معرفتِ خداوندی اور درجاتِ قرب میں رُکاوٹ کے بجائے اضافے اور تقرّب کا ذریعہ بنتے ہیں۔

حق گوئی کی جرأت.....ابوجعفر منصور کے رُعب داب اور ہیبت و دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ دربار میں کوئی شخص اس سے مخاطب ہونے کی بہت کم جرأت کرسکتا تھا، لیکن حق و صداقت کا رُعب ہر رُعب سے زیادہ ہے، اور جن لوگوں پر یہ حقیقت واضح ہوجائے، وہ مادّی جاہ و جلال کو پَرِ کاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔

با سلاطیں در فتد مردِ فقیر　　از شکوہ بوریا لرزد سریر

(اقبالؔ)

ایک مرتبہ چند عابد و زاہد، ابوجعفر منصور کے پاس آئے، منصور جی ہی جی میں بہت خوش ہوا کہ یہ لوگ جنھیں عوام میں عقیدت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے آج شاید کسی

دُنیوی غرض سے حاضرِ دربار ہوئے ہیں، غالباً اس کی ''اَنا'' کو بھی اس سے تسکین ہوئی ہوگی، لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ان میں سے ایک بے تکلّفانہ انداز میں اس کا نام لے کر کہنے لگا:

''اے عبداللہ! خدائے تعالیٰ نے تمام دُنیا تجھے عطا کر دی ہے، کچھ حصہ زمین کے بدلے تھوڑی سی آخرت کی آسائش بھی خرید لے، اس رات کو بھی کبھی کبھی یاد کیا کر جب تو قبر میں لیٹے گا، اور اس دن کو بھی کبھی یاد کر لیا کر جس کے بعد کوئی رات نہ آئے گی (یعنی روزِ قیامت)۔''

منصور یہ مؤثر نصیحت سن کر خاموش ہو گیا، پھر حکم دیا کہ ان لوگوں کو کچھ اِنعام دیا جائے۔

وہی شخص پھر بولا اور کہنے لگا:

''جس کو اِنعام کی خواہش ہوتی ہے، اسے حاکموں اور بادشاہوں سے اس قسم کی باتیں کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔''

اور یہ کہہ کر وہ جماعت خاموشی سے منصور کے دربار سے نکل گئی۔

مچھر کا خون اور اِنسان کا خون..... یزید بن ابی حبیب رحمۃ اللہ علیہ کا درجہ مصری علمائے حق میں بہت بلند مانا گیا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اپنے زمانۂ خلافت میں مصر کا مفتی مقرّر کیا تھا، عالم باعمل اور باوقار انسان تھے، حق گوئی اور بے باکی میں مشہور تھے۔

انہیں سلاطین و اُمراء سے ملنے کو جانا سخت ناپسند تھا، اگر کوئی بلاتا تو ٹال دیتے، اصرار کرتا تو کہہ دیتے کہ: ''کام تمہیں ہے، آجاؤ! فقیر کا دروازہ کھلا ہے۔''

ایک دفعہ آپ رحمۃ اللہ علیہ بیمار ہوئے، عیادت کرنے والوں میں حوثرہ بن سہیل بھی تھا، جو اس وقت مصر کا گورنر تھا، اس نے آپ رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا:

''اے ابو رجاء! جس کپڑے پر مچھر کا خون لگ جائے، اس کا کیا حکم ہے؟ کیا اس میں نماز ادا ہو سکتی ہے یا نہیں؟''

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سوال سن کر منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہ دیا۔

حوثرہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے اس طرزِ عمل سے حیران ہوا، جب وہ اُٹھ کر جانے لگا تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف دیکھا اور بڑے رُعب وداب سے فرمایا:

''اے بندۂ خدا! تم روزانہ خلقِ خدا کا ناحق خون بہاتے ہو، لیکن مجھ سے مسئلہ مچھروں کے خون کا دریافت کرتے ہو؟''

حوثرہ پر اس سوال سے ایسی ہیبت چھا گئی کہ گردن جھکا کر باہر نکل گیا اور زبان سے کچھ نہ کہا۔

گھوڑے کا چشمہ..... عقبہ بن نافع رحمہ اللہ اپنی افریقی مہمات کے سلسلے میں ایک لق ودق صحراء میں سے گزر رہے تھے، سفر بہت طویل تھا اور راستہ مفقود، پھرتے پھراتے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں لشکر کے پانی کا ذخیرہ ختم ہوگیا، دُور دُور تک پانی یا آبادی کا کوئی نام ونشان نہ تھا، پانی کی تلاش میں آدمی اِدھر اُدھر دوڑائے گئے، لیکن بے سود، انسان جانوں اور سواریوں کی ہلاکت کا اندیشہ صاف نظر آرہا تھا، فوج سخت پریشان تھی اور بے چینی کے عالم میں کچھ سوجھتا نہ تھا۔ اَمیرِ لشکر عقبہ بن نافع رحمہ اللہ نے دو رکعت نماز پڑھ کر ایک طویل دُعا کی، خدا کی شان دیکھو کہ اسی وقت عقبہ رحمۃ اللہ علیہ کے گھوڑے نے اپنے سم سے زمین کو کریدنا شروع کیا، جب تھوڑی سی ریت ہٹ گئی تو ایک بڑا پتھر دِکھائی دیا، عقبہ رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے اس پتھر کو ہٹایا گیا تو اس کے نیچے سے ٹھنڈے اور خوشگوار پانی کا ایک چشمہ نکل آیا۔ عقبہ رحمۃ اللہ علیہ نے خوشی کے عالم میں اپنے لشکریوں کو پکارا، اہلِ لشکر نے اس چشمے سے چھوٹی چھوٹی نالیاں مختلف سمتوں میں نکالیں اور پانی کا ذخیرہ مشکوں اور برتنوں میں جمع کرلیا گیا۔ اس تائیدِ غیبی سے مسلمان بہت خوش ہوئے اور اس مقام پر معمول سے زیادہ قیام کیا۔

اس چشمے کے ساتھ جو واقعہ وابستہ ہے اسی وجہ سے اس مقام کا نام ''ماء الفرس'' (گھوڑے کا چشمہ) مشہور ہوگیا۔

طلبِ علم کی ایک صحیح اور روشن مثال..... یحییٰ بن یحییٰ اندلسی، اِمام مالکؒ کے مایۂ ناز

شاگرد اور علمائے حق کے سرخیل تھے، انہوں نے طلبِ علم میں افریقہ، مصر، مکہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ کا سفر کیا، اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں ''عاقلِ اندلس'' کا خطاب دیا تھا، ان کی ساری عمر دِینی خدمات میں بسر ہوئی، حکومت کا کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔

اندلس کی اُموی سلطنت نے ان کی زندگی بھر ان کا پورا احترام قائم رکھا اور صرف قاضیوں کے تقرّر و تنزل میں ہی نہیں بلکہ گورنروں اور سپہ سالاروں تک کے عزل و نصب میں ان سے رائے طلب کی جاتی تھی اور ان کے مشورے کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

طلبِ علم کے زمانے میں ایک دفعہ وہ اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیٹھے تھے کہ کسی نے باہر سے آکر کہہ دیا کہ ہاتھی آیا ہے، اہلِ عرب کے ہاں چونکہ ہاتھی ایک عجیب و غریب مخلوق سمجھی جاتی تھی، اس لئے اسے دیکھنے کے لئے لوگ اُمنڈ پڑے، حتیٰ کہ اِمام مالکؒ کی مجلس سے بھی لوگ اُٹھ گئے، اور اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے درس موقوف فرما دیا، یحییٰ حسبِ معمول اِمام کی مجلس میں بیٹھے رہے۔

اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: ''تمہارے ملک میں بھی ہاتھی نہیں ہوتا، تم جا کر اسے کیوں نہیں دیکھ آتے؟''

یحییٰ نے عرض کیا کہ:

''حضرت! وطن اور احباب کو چھوڑ کر یہاں آپ کی خدمت میں اس غرض سے آیا ہوں کہ آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھا کروں، فی الحال مجھے فقط آپ کی زیارت مطلوب ہے اور آپ کے عمدہ خصائل و عادات کو سیکھنا چاہتا ہوں، میں اتنی دُور سے ہاتھی کو دیکھنے نہیں آیا۔''

اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قابلِ فخر شاگرد کے جواب کو بہت سراہا اور انہیں ''اندلس کے عقل مند'' کا خطاب دیا۔

اسلامی اندلس کی پوری تاریخ میں جو عزت و عظمت اور وجاہت یحییٰ کو حاصل ہوئی اور کسی اہلِ علم کو نہیں ہوئی، حقیقت میں وہ اندلس کے ''بے تاج حکمران'' تھے۔

غیر معمولی حافظہ.....ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان قوّتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں مشہور تھا، ان کے دادا اور والد دونوں بڑے قوی الحفظ تھے، لیکن تقی الدین ابن تیمیہ اس نعمت میں اپنے پورے خاندان سے سبقت لے گئے، اور بچپن ہی میں ان کے عجیب وغریب حافظے اور سرعتِ حفظ نے علماء واساتذہ کو متحیر کر دیا، اور دمشق میں اس کی شہرت پھیل گئی، صاحبِ ''العقود الدریہ'' لکھتے ہیں کہ:

''ایک مرتبہ حلب کے ایک بڑے عالم دمشق آئے، انہوں نے سنا کہ ایک بچہ ہے جس کا نام احمد بن تیمیہ ہے، اور وہ بہت جلد یاد کر لیتا ہے، ان کو اس کے دیکھنے اور امتحان لینے کا شوق ہوا، جس راستے سے ابن تیمیہ گزار کرتے تھے، وہاں وہ ایک درزی کی دُکان پر بیٹھ گئے، درزی نے کہا کہ: وہ بچہ آتا ہوگا، یہی اس کے مکتب کا راستہ ہے، آپ تشریف رکھئے۔ تھوڑی دیر میں کچھ بچے مکتب جاتے ہوئے گزرے، درزی نے کہا: دیکھئے وہ بچہ جس کے پاس بڑی سی تختی ہے، وہی ابن تیمیہ ہے، شیخ نے اس بچے کو آواز دی، وہ آیا تو اس کی تختی لے لی، اور کہا کہ: بیٹا! اس تختی پر جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو پونچھ ڈالو، جب وہ صاف ہو گیا تو انہوں نے اس پر کوئی گیارہ یا تیرہ حدیثیں لکھوا دیں اور کہا: ان کو پڑھ لو، بچے نے اس کو ایک مرتبہ غور سے پڑھا، شیخ نے تختی اُٹھالی، اور کہا کہ: سناؤ! بچے نے پوری حدیثیں سنا دیں، شیخ نے کہا کہ: اچھا اب ان کو بھی پونچھ ڈالو، پھر چند سندیں لکھ دیں اور کہا کہ: پڑھو! بچے نے غور سے دیکھا اور پھر سنا دیا، شیخ نے یہ تماشا دیکھ کر فرمایا کہ: اگر یہ بچہ جیتا رہا تو کوئی چیز بنے گا، اس لئے کہ اس زمانے میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔''

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی فقہاء پر گرفت.....ان فقہاء کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان کا سارا انہماک اسی غور وفکر میں ہے، انہوں نے اپنے فن میں ان چیزوں کو شامل نہیں کیا ہے جن سے قلوب میں رِقت پیدا ہوتی ہے، مثلاً قرآن مجید کی تلاوت، حدیث وسیرت کی سماعت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کا مطالعہ وبیان، سب جانتے ہیں کہ محض ازالۂ نجاست اور ماءِ متغیر کے مسائل کے بار بار دُہرانے سے قلوب میں نرمی اور خشیت نہیں پیدا ہو سکتی،

قلوب کو تذکیر اور مواعظ کی ضرورت ہے، تاکہ آخرت طلبی کی ہمت اور شوق پیدا ہو، اختلافی مسائل اگرچہ علومِ شریعت سے خارج نہیں، مگر حصولِ مقصد کے لے کافی نہیں ہیں، جو سلف کے حالات اور ان کے حقائق واسرار سے واقف نہیں، اور جن کے مذہب کو اس نے اختیار کیا ہے، ان کے حالات سے باخبر نہیں، وہ ان کے راستے پر کیسے چل سکتا ہے؟ یاد رکھنا چاہئے! کہ طبیعت چور ہے، اگر اس کو اسی زمانے کے لئے لوگوں کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اہلِ زمانہ کے طبائع سے اخذ کرلے گی، اور ان ہی کی طرح ہو جائے گی، اور اگر متقدمین کے حالات اور طریقوں کا مطالعہ کیا جائے گا تو ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی جائے گی، اور ان کا رنگ اور ان کے سے اخلاق پیدا ہوں گے، سلف میں سے ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ایک حدیث جس سے میرے دِل میں رِقت پیدا ہو، قاضی شریح کے سو فیصلوں سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ (تلبیس اِبلیس، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت، ج:۱،ص:۲۳۵)

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فاروقی جوش کو نہیں روک سکے..... سلف اور خلف میں اس کی بے شمار نظیریں ملتی ہیں کہ اہلِ حمیت اور محافظینِ شریعت نے جب کسی شخص کا کوئی ایسا قول دیکھا جو اس کو سنت وشریعت کے نصوص اور اس کے متواتر قطعی عقائد کے خلاف نظر آیا، خواہ وہ حقیقت میں نہ ہو، لیکن انسان اپنی نظر اور بصیرت وفہم ہی کا مکلّف ہے، عالم السرائر اور عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ تو انہوں نے اس قول کی تردید کی اور صاحبِ قول کی عظمت وشہرت اور اس کی ولایت ومقبولیت کے آثار بھی اس کو اس تردید سے باز نہ رکھ سکے، اس لئے کہ ان کے نزدیک شریعت کی حرمت اور مقامِ نبوّت کی عظمت ہر حرمت سے مقدم اور ہر عظمت سے بالاتر تھی، خود حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ایسے مواقع پر اپنے فاروقی جوش اور حمیتِ دِینی کے خروش کو روک نہیں سکے اور بڑی قوّت سے ایسے اقوال کی تردید کرتے ہیں، ان کو کسی نے لکھا کہ شیخ عبدالکبیر یمنی اس کے قائل ہیں کہ اللہ عالم الغیب نہیں ہے، اس پر اپنے مکتوبات میں تحریر فرماتے ہیں:

''مخدومی! فقیر کو ہرگز اس طرح کی باتیں سننے کی تاب نہیں، بے اختیار میری

رَگِ فاروقی حرکت میں آجاتی ہے، اور ایسے اقوال کی تاویل وتوجیہ کی فرصت نہیں دیتی، اس طرح کا مقولہ شیخ کبیر یمنی کا ہو یا شیخ اکبر شامی کا، ہمیں محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام درکار ہے نہ کہ محی الدین (ابن) عربی وصدرالدین قونوی اور عبدالرزّاق کاشی کا، ہم کو نص (نصوصِ کتاب وسنت مراد ہیں) سے کام ہے، نہ کہ فص (شیخ اکبر کی مشہور کتاب ''فصوص الحکم'' کی طرف اشارہ ہے) سے، فتوحاتِ مدنیہ (کتاب وسنت) نے ہم کو فتوحاتِ مکیہ (شیخ اکبر کی مشہور کتاب) سے مستغنی کردیا ہے۔''

معاملات کی صفائی اور تنازعات..... ہمارے معاشرے میں آپس کے جھگڑوں اور تنازعات کا جو سیلاب اُمڈا ہوا ہے، اس کا تھوڑا سا اندازہ عدالت میں دائر ہونے والے مقدمات سے ضرور ہوسکتا ہے، لیکن یہ اندازہ یقیناً ناکافی اور حقیقت سے بہت کم ہوگا، کیونکہ بے شمار تنازعات وہ ہیں جن کے عدالت تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی، عدالت سے رُجوع کرنے میں وقت اور پیسے کا جو بے تحاشا صَرفہ ہوتا ہے، اس کی وجہ سے بہت سے لوگ عدالت سے رُجوع نہیں کرپاتے، اس کے بجائے فریقین میں سے ہر ایک اپنی اپنی بساط کی حد تک دُوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، اور اس طرح عداوت کی آگ بھڑکتے بھڑکتے کئی کئی پشتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

ان تنازعات کی تہہ میں اگر دیکھا جائے تو وہی زَر اور زمین کے معروف اسباب کارفرما نظر آتے ہیں، روپیہ پیسہ اور زمین جائیداد کا جھگڑا بڑے بڑے پُرانے تعلقات کو دیکھتے ہی دیکھتے بھسم کرڈالتا ہے، اور اس کی وجہ سے بڑی بڑی مثالی دوستیاں آن کی آن میں دُشمنیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں۔

اس صورتِ حال کے بہت سے اسباب ہیں، لیکن ایک بہت بڑا سبب ''معاملات'' کو صاف نہ رکھنا ہے، ہمارے دِین کی ایک انتہائی زَرّیں تعلیم یہ ہے کہ:

''آپس میں رہو بھائیوں کی طرح، لیکن لین دین کے معاملات اجنبیوں کی

طرح کرو۔''

مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں ایک دُوسرے کے ساتھ برتاؤ ایسا کرو جیسے ایک بھائی کو دُوسرے کے ساتھ کرنا چاہئے، اس میں ایثار، مروّت، رواداری، تحمل اور اپنائیت کا مظاہرہ کرو، لیکن جب روپے پیسے کے لین دین، جائیداد و معاملات اور شرکت وحصہ داری کا مسئلہ آجائے تو بہتر تعلقات کی حالت میں بھی انہیں اس طرح انجام دو جیسے دو اجنبی شخص انہیں انجام دیتے ہیں، یعنی معاملے کی ہر بات صاف ہونی چاہئے، کوئی بات ابہام میں رہے اور نہ معاملے کی حقیقت میں کوئی اشتباہ باقی رہے۔

اگر محبت، اتفاق اور خوشگوار تعلقات کی حالت میں دِین کی اس گراں قدر تعلیم پر عمل کرلیا جائے تو بعد میں پیدا ہونے والے بہت سے فتنوں اور جھگڑوں کا سدِ باب ہوجاتا ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں اس اہم اُصول کو جس طرح نظر انداز کیا جارہا ہے، اس کے چند مظاہر یہ ہیں:

① ..... بسا اوقات ایک کاروبار میں کئی بھائی یا باپ بیٹے مشترکہ طور پر ایک ساتھ کام کرتے ہیں، اور کسی حساب وکتاب کے بغیر سب لوگ مشترک کاروبار سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق خرچ کرتے رہتے ہیں، نہ یہ بات طے ہوتی ہے کہ کاروبار میں کس کی کیا حیثیت ہے؟ آیا وہ کاروبار میں تنخواہ پر کام کررہے ہیں؟ یا کاروبار کے حصہ دار ہیں؟ تنخواہ ہے تو کتنی؟ اور حصہ ہے تو کس قدر؟ بس ہر شخص اپنی خواہش یا ضرورت کے مطابق کاروبار کی آمدنی استعمال کرتا رہتا ہے اور اگر کبھی کوئی شخص یہ تجویز کرے کہ کاروبار میں حصے یا تنخواہ وغیرہ متعین کرلینی چاہئے تو اسے محبت اور اتفاق کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اس طرح کے کاروبار کا انجام اکثر وبیشتر یہ ہوتا ہے کہ دِل ہی دِل میں ایک دُوسرے کے خلاف رنجشیں پرورش پاتی رہتی ہیں، بالخصوص جب حصہ داروں کے یہاں شادیاں ہوجاتی ہیں تو ہر شخص یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دُوسرے نے کاروبار سے زیادہ فائدہ اُٹھایا ہے اور مجھ پر ظلم ہوا ہے، اگرچہ ظاہری سطح پر باہم رُورعایت کا وہی انداز

باقی نظر آتا ہے لیکن اندر ہی اندر رنجشوں کا لاوا پکتا رہتا ہے، اور بالآخر جب یہ رنجشیں بدگمانیوں کے ساتھ مل کر پہاڑ بن جاتی ہیں تو یہ آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے اور محبت و اتفاق کے سارے دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، زبانی تو تکار سے لے کر لڑائی جھگڑے اور مقدمہ بازی تک کسی کام سے دریغ نہیں ہوتا، بھائی بھائی کی بول چال بند ہو جاتی ہے، ایک بھائی دُوسرے کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں رہتا، جس کے قابو میں کاروبار کا جتنا حصہ آتا ہے، وہ اس پر قابض ہو کر عدل و انصاف کا بے دریغ خون کرتا ہے اور پھر اپنی نجی مجلسوں میں ایک دُوسرے کے خلاف بدزبانی اور بدگمانی کا وہ طوفان کھڑا ہوتا ہے کہ الامان! پھر چونکہ سالہا سال تک مشترک کاروبار کا نہ کوئی اُصول طے شدہ تھا، نہ کوئی حساب و کتاب رکھا گیا، اس لئے اگر اختلافات پیش آنے کی صورت میں افہام و تفہیم سے کام لینے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو معاملات کی ڈور اُلجھ کر اتنی پیچیدہ ہو چکی ہوتی ہے کہ منصفانہ تصفیے کے لئے اس کا سرا پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے، ہر شخص واقعات کو اپنے مفاد کی عینک سے دیکھتا ہے اور مصالحت کا کوئی ایسا فارمولا وضع کرنا بھی سخت مشکل ہو جاتا ہے جو تمام متعلقہ فریقوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ یہ سارا فساد اکثر و بیشتر اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ کاروبار کے آغاز میں یا اس میں مختلف افراد کی شمولیت کے وقت معاملے کو معاملے کی طرح طے نہیں کیا جاتا، اگر شروع ہی سے یہ بات واضح ہو کہ کس شخص کی کیا حیثیت ہے؟ اور کس کے کیا حقوق و فرائض ہیں؟ اور یہ ساری باتیں تحریری شکل میں محفوظ ہوں تو بہت سے جھگڑوں اور بعد میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا شروع ہی سے سدِ باب ہو جائے۔

قرآنِ کریم میں جو آیت سب سے طویل آیت ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ جب تم کوئی اُدھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، جب معمولی رقم اُدھار دینے پر یہ تاکید ہے تو کاروبار کے پیچیدہ معاملات کو تحریر میں لانے کی اہمیت کتنی زیادہ ہوگی؟

یہ حکم اسی لئے دیا گیا ہے تاکہ بعد میں تنازعات اور اختلافات پیدا نہ ہوں اور اگر ہوں تو

انہیں حق وانصاف کے مطابق نمٹانا آسان ہو، لہٰذا اگر کسی کاروبار میں ایک سے زیادہ افراد کام کررہے ہیں تو پہلے ہی قدم پر ان میں سے ہر شخص کی حیثیت کا تعین ضروری ہے، یہاں تک کہ اگر باپ کے کاروبار میں کوئی بیٹا شامل ہوا ہے تو اس کے بارے میں بھی پہلے ہی دن سے یہ طے ہونا ضروری ہے کہ وہ تنخواہ پر کام کرے گا؟ یا کاروبار میں باقاعدہ حصہ دار ہوگا؟ یا محض اپنے باپ کی مدد کرے گا؟ پہلی صورت میں اس کی تنخواہ متعین ہونی چاہئے اور یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ وہ کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار نہیں ہے، اور دُوسری صورت میں اگر اسے کاروبار کی ملکیت میں حصہ دار بنایا ہے تو شرعاً اس کی پہلی شرط تو یہ ہے کہ اس کی طرف سے کاروبار میں کچھ سرمایہ ضرور شامل ہونا چاہئے (جس کی صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ باپ اسے کچھ نقد رقم ہبہ کردے اور وہ اس رقم سے کاروبار کا ایک متعین فیصد حصہ خرید لے)، دُوسرے یہ بات تحریری طور پر ایک معاہدۂ شرکت کی شکل میں محفوظ کرلینی چاہئے اور اس معاہدے میں یہ بھی صراحت ہونا ضروری ہے کہ نفع میں کتنا فیصد حصہ کس کا ہوگا؟ تاکہ بعد میں کوئی اُلجھن پیدا نہ ہو۔

اگر کسی ایک حصہ دار کو کاروبار میں کام زیادہ کرنا پڑتا ہو تو یہ بات بھی طے ہونی چاہئے کہ آیا وہ یہ زیادہ کام رضا کارانہ طور پر کرے گا یا اس زیادہ کام کا کوئی معاوضہ اسے دیا جائے گا؟ اگر کوئی معاوضہ دیا جائے گا تو وہ نفع کے فیصد حصے میں اضافہ کرکے دیا جائے گا یا متعین تنخواہ کی صورت میں؟ غرض ہر فریق کے حقوق وفرائض اتنے واضح ہونے ضروری ہیں کہ ان میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

اگر بالفرض کسی کاروبار میں اب تک ان باتوں پر عمل نہیں کیا گیا، تو جتنی جلد ہوسکے ان اُمور کو طے کرلینا ضروری ہے، اور اس معاملے میں کسی شرم، مروّت اور طعن وتشنیع کو آڑے نہ آنے دینا چاہئے، معاملات کی اس صفائی کو محبت واُخوت اور اتحاد واتفاق کے خلاف سمجھنا بہت بڑا دھوکا ہے، بلکہ درحقیقت محبت اور اتفاق کی پائیداری ان اُمور پر منحصر ہے ورنہ آگے چل کر یہ سطحی محبت دِلوں میں عداوت کو جنم دے سکتی ہے اور اسی لئے اسلام نے یہ تعلیم دی ہے

کہ: ''رہو بھائیوں کی طرح، لیکن معاملات اجنبیوں کی طرح کرو۔''

② .....اسی طرح ہمارے معاشرے میں بالخصوص متوسط آمدنی والے طبقے میں اپنے ملکیتی مکان کا حصول ایک بڑا مسئلہ ہے، اور عموماً کسی مکان کی تعمیر یا اس کی خریداری خاندان کے کئی افراد مل کر کرتے ہیں، اگر باپ نے کوئی مکان بنانا شروع کیا ہے تو بیٹے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اس میں اپنی رقمیں لگاتے ہیں، لیکن عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ یہ رقمیں کچھ سوچے سمجھے بغیر اور بسا اوقات کوئی حساب رکھے بغیر لگادی جاتی ہیں، یعنی یہ بات طے نہیں ہوتی کہ بیٹا جو رقم مکان کی تعمیر کے لئے دے رہا ہے، آیا یہ باپ کی خدمت میں ہدیہ ہے؟ یا قرض ہے؟ یا وہ مکان کی ملکیت میں حصہ دار بننے کے لئے یہ رقم خرچ کر رہا ہے؟ پہلی صورت میں نہ وہ مکان کی ملکیت کا حصہ دار ہوگا، نہ باپ سے یہ رقم کسی وقت واپس لینے کا حق دار ہوگا، دُوسری صورت میں مکان تو تنہا باپ کی ملکیت ہوگا، لیکن دی ہوئی رقم اس کے ذمے قرض سمجھی جائے گی، تیسری صورت میں اپنی لگائی ہوئی رقم کے بقدر وہ مکان کی ملکیت میں بھی شریک ہوگا اور مکان کی قیمت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے حصے کی مالیت میں بھی اضافہ ہوگا۔ غرض ہر صورت کے تقاضے اور نتائج مختلف ہیں، لیکن چونکہ رقم لگاتے وقت ان تینوں میں سے کوئی صورت طے نہیں ہوتی، نہ رقموں کا پورا حساب رکھا جاتا ہے، اس لئے آگے چل کر جب مکان کی قیمت بڑھتی ہے تو آپس میں اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں اور خاص طور پر باپ کے انتقال کے بعد جب ترکے کی تقسیم کا مرحلہ آتا ہے تو یہ اختلافات ایک لاینحل مسئلے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، ان کی وجہ سے بھائیوں میں پھوٹ چھٹاؤ کی نوبت آجاتی ہے اور لڑائی جھگڑوں سے خاندان کا خاندان متأثر ہوتا ہے۔

اگر اسلامی اَحکام پر عمل کرتے ہوئے تعمیر کے شروع ہی میں یہ ساری باتیں طے کر لی جائیں اور انہیں تحریری طور پر قلم بند کر لیا جائے تو اس خاندانی فساد کا راستہ بند ہو جائے۔

③ ..... جب خاندان کے کسی بڑے کا انتقال ہوتا ہے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ جلد از جلد اس کا ترکہ اس کے شرعی وارثوں کے درمیان تقسیم کیا جائے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں

شریعت کے اس حکم سے شدید غفلت برتی جاتی ہے، بعض اوقات تو جس کے جو ہاتھ لگتا ہے، لے اُڑتا ہے اور حلال وحرام ہی کی پروانہیں کی جاتی، اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے پیشِ نظر بد دیانتی نہیں ہوتی لیکن ناواقفیت یا لاپروائی کی وجہ سے میراث تقسیم نہیں ہوتی، اور اگر مرحوم نے کوئی کاروبار چھوڑا ہے تو اس پر وہی بیٹا کام کرتا رہتا ہے جو مرحوم کی زندگی میں کرتا تھا، لیکن یہ طے نہیں کیا جاتا کہ اب کاروبار کی ملکیت کس تناسب سے ہوگی؟ شرعی ورثاء کے حصوں کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟ کام کرنے والے کو اس کی خدمات کا معاوضہ کس طرح ادا کیا جائے گا؟ ترکے میں کونسی چیز کس کے حصے میں آئے گی؟ بلکہ اگر کوئی شخص ترکے کی تقسیم کی طرف توجہ دِلائے بھی تو اس کی تجویز کو ایک معیوب تجویز سمجھا جاتا ہے کہ ابھی مرنے والے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا کہ لوگوں کو بٹوارے کی فکر پڑ گئی ہے۔

حالانکہ یہ بٹوارہ شریعت کا حکم بھی ہے، معاملات کی صفائی کا تقاضا بھی اور اسے نظر انداز کرنے نتیجہ وہی ہوتا ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے بعد ورثاء کو اپنے اپنے حقوق کا خیال آتا ہے، رنجشیں پیدا ہوتی ہیں، ترکے کی اشیاء کی قیمتوں میں زمین وآسمان کا فرق پڑ جاتا ہے اور چونکہ کوئی بات پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتی، اس لئے اب معاملات اُلجھتے جاتے ہیں، ان کے مناسب تصفیے میں سخت مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اور ان سب باتوں کا نتیجہ لڑائی جھگڑے کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اگر شریعت کے حکم کے مطابق وقت پر ترکے کی تقسیم عمل میں آجائے اور باہمی رضامندی اور اتحاد واتفاق کے ساتھ تمام ضروری باتیں طے پا جائیں تو آئندہ تنازعات پیدا ہونے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے اور باہمی محبت واُخوت کو فروغ ملتا ہے۔

یہ تو میں نے صرف تین سادہ سی مثالیں پیش کی ہیں، ورنہ اگر معاشرے میں پھیلے ہوئے جھگڑوں کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تو نظر آئے گا کہ معاملات کو صاف نہ رکھنا ہمارے معاشرے کا ایک ایسا روگ بن چکا ہے جس نے فتنہ وفساد کی آگ بھڑکا رکھی ہے، معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، صاف ستھرا ہونا چاہئے، اس کی شرائط واضح اور غیر مبہم ہونی چاہئیں اور اس سلسلے

میں کوئی شرم، حیا اور لحاظ و مروّت آڑے نہیں آنی چاہئے، جب ایک مرتبہ معاملے کی شرائط اس طرح طے پا جائیں تو اس کے بعد باہمی برتاؤ میں جو شخص جس سے جتنا حسنِ سلوک کر سکے، بہتر ہی بہتر ہے، اور یہی مطلب ہے اس ارشاد کا کہ: ''رہو بھائیوں کی طرح، اور معاملات کرو اجنبیوں کی طرح۔'' (ذکر و فکر، روزنامہ ''جنگ'')

شیطان کا ایک بڑا دھوکا..... عوام پر تنقید کرتے ہوئے ابن جوزیؒ ''تلبیسِ اِبلیس'' میں لکھتے ہیں: ''شیطان نے بہت سے عوام کو یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ وعظ و ذکر کی مجالس میں شریک ہونا اور متاثر ہو کر رونا ہی سب کچھ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ مقصود محفلِ خیر میں شرکت اور رِقت ہے، اس لئے کہ وہ واعظوں سے اس کے فضائل سنتے رہتے ہیں، اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود عمل ہے، تو یہ سننا اور عمل کرنا ان کے لئے گرفت کا باعث اور وبالِ جان ہے۔ میں ذاتی طور پر بہت سے آدمیوں کو جانتا ہوں جو سالہا سال سے مجلسِ وعظ میں شریک ہوتے ہیں اور روتے ہیں، لیکن نہ سود لینا چھوڑتے ہیں، نہ تجارت میں دھوکا دینے سے باز آتے ہیں، ارکانِ صلوٰۃ سے بے خبر ہیں، مسلمانوں کی غیبت، والدین کی نافرمانی میں بھی مبتلا ہیں، شیطان نے یہ دھوکا دے رکھا ہے کہ مجلسِ وعظ کی حاضری اور گریہ و بکاء ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا، بعض کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ نفسِ صحبتِ صالحین ہی معرفت کا ذریعہ ہے۔

ایک عجیب سوال کا عجیب جواب..... ایک مرتبہ اِستفتاء آیا کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ ایسی عبادت کرے گا جس میں عبادت کے وقت کوئی دُوسرا شریک نہیں ہوگا، اگر اس نے قسم پوری نہیں کی تو اس کی بیوی کو تین طلاق۔ علماء یہ اِستفتاء سن کر حیرت میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی عبادت ہو سکتی ہے جس میں وہ بالکل تنہا ہو اور رُوئے زمین پر کوئی شخص بھی اس وقت وہ عبادت نہ کر رہا ہو، حضرت شیخ عبدالقادری جیلانی رحمہ اللہ کے پاس اِستفتاء آیا تو بے تکلف فرمایا کہ: مطاف اس کے لئے خالی کر دیا جائے، اور وہ سات چکر کر کے خانۂ کعبہ کا طواف تنہا مکمل کرے۔ علماء نے یہ جواب سن کر بے ساختہ دادِ تحسین دی اور کہا کہ یہی ایک صورت ہے کہ وہ بلا شرکتِ غیرے عبادت کرے اور اپنی قسم پوری کر دے، اس لئے کہ طواف بیت اللہ پر

موقوف ہے اور مطاف اس شخص کے لئے مخصوص کر دیا جائے، اب اس عبادت میں کہیں بھی شرکت کا امکان نہیں۔ (الطبقات الکبریٰ للشعرانی، ج:۱،ص:۱۲۶)

سلف صالحین کے حالات کے مطالعے کی ضرورت.....علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ باوجود محدث وفقیہ ہونے کے اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ قلب کی اصلاح اور ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے مؤثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کے مطالعے کی ضرورت ہے، ''تلبیسِ اِبلیس'' اور ''صید الخاطر'' دونوں میں فقہاء ومحدثین اور طلباء وعلماء کو وہ اس کا مشورہ دیتے ہیں اور اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں، ''صید الخاطر'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں نے دیکھا کہ فقہ اور سماعِ حدیث میں انہماک ومشغولیت قلب میں صلاحیت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں، اس کی تدبیر یہی ہے کہ اس کے ساتھ مؤثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کا مطالعہ بھی شامل کیا جائے، حرام وحلال کا خالی علم قلب میں رِقت پیدا کرنے کے لئے کچھ زیادہ سودمند نہیں، قلوب میں رِقت پیدا ہوتی ہے، مؤثر احادیث و حکایات سے اور سلف صالحین کے حالات سے، اس لئے کہ اُن نقول وروایات کا جو مقصود ہے، وہ ان کو حاصل تھا، اَحکام پر ان کا عمل شکلی اور ظاہری تھا، بلکہ ان کو ان کا اصلی ذوق اور لبِ لباب حاصل تھا، اور یہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ عملی تجربہ اور خود آزمائش کرنے کے بعد ہے، سلف کی ایک جماعت کسی نیک اور بزرگ شخص سے محض اس کے طور طریقے کو دیکھنے کے لئے ملنے جاتی تھی، علم کے استفادے کے لئے نہیں، اس لئے کہ یہ طور وطریقہ اس کے علم کا اصلی پھل تھا۔ (صید الخاطر، بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت)

بعض گناہوں کی کچھ سزا دُنیا میں بھی ملتی ہے.....بعض گناہوں کی سزا نقد دُنیا میں بھی ملتی ہے، جیسے سامری اور اس کے ساتھیوں کا حال ہے کہ انہوں نے گوسالہ پرستی سے صحیح توبہ نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو دُنیا میں ہی خوار وذلیل کر دیا کہ اس کو موسیٰ علیہ السلام نے یہ حکم دے دیا کہ وہ سب لوگوں سے الگ رہے، نہ وہ کسی کو ہاتھ لگائے، نہ کوئی اس کو ہاتھ لگائے، چنانچہ وہ عمر بھر اسی طرح جانوروں کے ساتھ پھرتا رہا، کوئی انسان اس کے پاس نہ آتا تھا۔

تفسیر قرطبی میں بروایت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ عذاب مسلط کر دیا تھا کہ جب کوئی اس کو ہاتھ لگائے یا وہ کسی کو ہاتھ لگائے تو فوراً دونوں کو بخار چڑھ جاتا تھا۔ (قرطبی) اور تفسیر ''رُوح المعانی'' میں ہے کہ یہ خاصیت اس کی نسل میں بھی آج تک باقی ہے۔ آگے فرمایا کہ ہم تو افتراء پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں کہ دُنیا میں ہی ذلیل ہو جائیں۔

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: جو لوگ دِین میں بدعت اختیار کرتے ہیں وہ بھی اس افتراء علی اللہ کے مجرم ہو کر اس سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ (مظہری) اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت سے استدلال کر کے فرمایا کہ: دِین میں اپنی طرف سے بدعات ایجاد کرنے والوں کی یہی سزا ہے کہ آخرت میں غضبِ اِلٰہی کے مستحق ہوں گے اور دُنیا میں ذِلت کے۔ (قرطبی)

ایک آیت سے آٹھ مسائلِ شرعیہ..... خلاصہ یہ ہے کہ ''کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا'' کے کلمات سے آٹھ مسائلِ شرعیہ نکلے، اوّل یہ کہ کھانا پینا بقدرِ ضرورت فرض ہے، دُوسرے یہ کہ جب تک کسی چیز کی حرمت کسی دلیلِ شرعی سے ثابت نہ ہو جائے ہر چیز حلال ہے، تیسرے یہ کہ جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع کر دیا ان کا استعمال اِسراف اور ناجائز ہے، چوتھے یہ کہ جو چیزیں اللہ نے حلال کی ہیں اُن کو حرام سمجھنا بھی اِسراف اور سخت گناہ ہے، پانچویں یہ کہ پیٹ بھر جانے کے بعد اور کھانا ناجائز ہے، چھٹے یہ کہ اتنا کم کھانا جس سے کمزور ہو کر ادائے واجبات کی قدرت نہ رہے، دُرست نہیں ہے، ساتویں یہ کہ ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہنا بھی اِسراف ہے، آٹھویں یہ بھی اِسراف ہے کہ جب کبھی کسی چیز کو جی چاہے تو ضرور ہی اس کو حاصل کرے۔

یہ تو اس آیت کے فوائدِ دِینیہ ہیں، اور اگر طبّی طور پر غور کیا جائے تو صحت و تندرستی کے لئے اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں، کھانے پینے میں اعتدال، ساری بیماریوں سے امان ہے۔

تفسیر ''رُوح المعانی'' اور ''مظہری'' وغیرہ میں ہے کہ امیر المؤمنین ہارون رشید کے

پاس ایک نصرانی طبیب علاج کے لئے رہتا تھا، اس نے علی بن حسین بن واقد سے کہا کہ تمہاری کتاب یعنی قرآن میں علمِ طب کا کوئی حصہ نہیں، حالانکہ دُنیا میں دو ہی علم، علم ہیں، ایک علمِ ادیان اور دُوسرا علمِ ابدان، جس کا نام طب ہے۔ علی بن حسین نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سارے فنِ طب وحکمت کو آدھی آیتِ قرآن میں جمع کر دیا ہے، وہ یہ کہ ارشاد فرمایا: "کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا" (اور تفسیر ابن کثیر میں یہ قول بعض سلف کے حوالے سے بھی نقل کیا ہے)۔ پھر اس نے کہا کہ اچھا تمہارے رسولؐ کے کلام میں بھی طب کے متعلق کچھ ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کلمات میں سارے فنِ طب کو جمع کر دیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: معدہ بیماریوں کا گھر ہے، اور مضر چیزوں سے پرہیز ہر دوا کی اصل ہے، اور ہر بدن کو وہ چیز دو جس کا وہ عادی ہے (کشاف، رُوح) نصرانی طبیب نے یہ سن کر کہا کہ تمہاری کتاب اور تمہارے رسولؐ نے جالینوس کے لئے کوئی طب نہیں چھوڑی۔

بیہقی نے شعب الایمان میں بروایت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: معدہ بدن کی حوض ہے، سارے بدن کی رگیں اسی حوض سے سیراب ہوتی ہیں، اگر معدہ دُرست ہے تو ساری رگیں یہاں سے صحت مند غذا لے کر لوٹیں گی، اور وہ خراب ہے تو ساری رگیں بیماری لے کر بدن میں پھیلیں گی۔

محدثین نے ان روایاتِ حدیث کے الفاظ میں کچھ کلام کیا ہے، لیکن کم کھانے اور محتاط رہنے کی تاکیدات جو شمار احادیث میں موجود ہیں، ان پر سب کا اتفاق ہے۔ (رُوح)

کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے..... جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجے میں محمود بھی ہو، مگر اس کے کرنے سے کوئی فساد لازم آتا ہو، یا اس کے نتیجے میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہوں وہ کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے، کیونکہ معبوداتِ باطلہ یعنی بتوں کو بُرا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے، اور ایمانی غیرت کے تقاضے سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب اور محمود بھی ہو، مگر چونکہ اس کے نتیجے میں یہ اندیشہ ہو گیا کہ لوگ اللہ جل شانہ کو بُرا

کہیں گے تو بتوں کو بُرا کہنے والے اس بُرائی کا سبب بن جائیں گے، اس لئے اس جائز کام کو بھی قرآنِ کریم میں منع کر دیا گیا۔

اس کی ایک اور مثال بھی حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ: کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی نہ دے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ تو کسی شخص سے ممکن ہی نہیں کہ اپنے ماں باپ کو گالی دے۔ فرمایا کہ: ہاں! انسان خود تو ان کو گالی نہیں دیتا، لیکن جب وہ کسی دُوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دے اور اس کے نتیجے میں وہ دُوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دے، تو اس گالی دِلوانے کا سبب یہ بیٹا بنا، تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اُس نے خود گالی دی۔

اسی معاملے کی ایک دُوسری مثال عہدِ رسالت میں یہ پیش آئی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ بیت اللہ شریف زمانۂ جاہلیت کے کسی حادثے میں منہدم ہو گیا تھا، تو قریشِ مکہ نے بعثت ونبوّت سے پہلے اس کی تعمیر کرائی، اس تعمیر میں چند چیزیں بناءِ ابراہیمی کے خلاف ہو گئیں، ایک تو یہ کہ جس حصے کو حطیم کہا جاتا ہے یہ بھی بیت اللہ کا جز ہے، تعمیر میں اس کو سرمایہ کم ہونے کی بناء پر چھوڑ دیا، دُوسرے بیت اللہ شریف کے دو دروازے شرقی اور غربی تھے، ایک داخل ہونے کے لئے، دُوسرا باہر نکلنے کے لئے، اہلِ جاہلیت نے غربی دروازہ بند کر کے صرف ایک کر دیا، اور وہ بھی سطحِ زمین سے بلند کر دیا تا کہ بیت اللہ شریف میں داخلہ صرف ان کی مرضی واجازت سے ہو سکے، ہر شخص بے محابانہ جا سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میرا دِل چاہتا ہے کہ بیت اللہ کی موجودہ تعمیر کو منہدم کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعمیر کے بالکل مطابق بنا دُوں، مگر خطرہ یہ ہے کہ تمہاری قوم یعنی عام عرب ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں، بیت اللہ کو منہدم کرنے سے کہیں ان کے دِلوں میں کچھ شبہات نہ پیدا ہو جائیں۔ (معارف القرآن، ج:۳، ص:۴۲۱)

شادی مگر سادی..... حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ''رحمۃ للعالمین'' ہیں، آپ نے رحمت کو عام فرمایا اور رحمت سے اُمت کو نجات دِلائی، آپ کی رحمت کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر اور

انسانیت بلکہ مخلوق کے ہر طبقے پر پڑا، آج کی اس نشست میں ایک ایسی رحمت کا تذکرہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمتِ مسلمہ کو عطا فرمائی مگر اُمت نے اب اس انمول رحمت کو چھوڑ کر خوفناک زحمت کو اپنے گلے لگایا ہے۔

شادی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، ہر انسان کی ضرورت ہے، اور انسانی فطرت کا اہم ترین تقاضا ہے، خود ساختہ مذاہب نے شادی کو مہنگا اور مشکل بنایا، چنانچہ زنا، بدکاری، طرح طرح کی بیماریوں اور سینکڑوں معاشی اور معاشرتی بُرائیوں نے انہیں جکڑ لیا اور انہیں ایسا جکڑا کہ اب تک چھوٹ نہیں پائے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کو آسان اور گناہ کو مشکل بنانے کا اعلان فرمایا اور دیکھتے ہی دیکھتے معاشرہ پاک اور آزاد ہوگیا، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اتنی سادگی سے شادی کرتے تھے کہ بعض اوقات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع تک نہیں ہوتی تھی، تھوڑا سا مہر رکھا جاتا تھا، برات کا کوئی نظام نہیں تھا، شادی کارڈ یا شخصی پیغام کا کوئی تصور نہیں تھا، اگر جیب اجازت دیتی تو ہلکا سا ولیمہ کرلیا جاتا تھا، اگر استطاعت نہ ہوتی تو ہر کوئی اپنے گھر سے کھانا لے کر دُولہا کے ساتھ بیٹھ کر کھالیتا اور یوں خوشی کو پھیلایا جاتا اور منایا جاتا۔

جہیز نام کی مروّجہ لعنت کا تصور تک نہیں تھا، یہ بے غیرتی تو ہندوؤں نے سکھائی ہے، لڑکی اتنی گھٹیا اور سستی چیز ہے کہ اسے کسی کے نکاح میں دینے کے لئے بطورِ رشوت کے جہیز دینا پڑتا ہے، جبکہ اسلام نے مسلمان لڑکی کو بے حد عزت دی ہے، اس کی شرافت اور اس کی عصمت ہی وہ قیمتی چیز ہے، جس کے بدلے اسلام نے دُولہا کو حکم دیا کہ مہر ادا کرے، مگر آج کا بے غیرت دُولہا اس شرافت اور عصمت کے نور کو گھر لانے کے لئے جہیز کا مطالبہ کرتا ہے، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس کا تصور بھی نہیں تھا، وہاں تو منٹوں میں شادی ہوتی تھی اور پاکیزگی کا یہ مضبوط بندھن مال کے ہاتھوں گروی نہیں رکھا جاتا تھا۔

آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اعلان فرمارہے تھے کہ زیادہ برکت والا نکاح وہی ہوگا جس میں خرچہ کم ہوگا اور ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی فرمارہے تھے کہ زانی کے لئے پتھر ہیں، یعنی

نامرادی اور سنگسار۔ ان دونوں اعلانات نے عرب معاشرے کی حالت بدل دی، ہر نوجوان مرد کو بآسانی نوجوان بیوی مل جاتی تھی، جس کے پاس وہ سکون پاتا تھا اور اپنے تقوے کو اس کے دامن میں محفوظ کرتا تھا، کسی بیوہ کو رشتے کی کمی نہیں تھی کہ وہ گناہ کا خیال بھی دِل میں لائے، ایک شادی پر گزارا نہیں ہوتا تھا تو پہلی بیوی خود اپنے خاوند کے لئے دُوسری بیوی ڈھونڈ لیتی تھی اور اس طرح ایک پاکیزہ اور صحت مند معاشرہ وجود میں آیا۔ اس معاشرے میں گناہ کے صرف چند ہی واقعات ہوئے، ان واقعات کو اُنگلیوں پر گنا جاسکتا ہے، بلکہ آج کے اعداد وشمار کے مطابق اس زمانے میں فی منٹ اتنے واقعات ہو جاتے ہیں یا ہو رہے ہوتے ہیں جتنے اس زمانے میں دس سال میں بھی نہیں ہوئے، آخر یہ تبدیلی کیسے آئی؟

آج نیکی مہنگی اور مشکل بنادی گئی ہے، جبکہ گناہ سستا اور آسان کر دیا گیا ہے، نکاح کا نام سن کر ماں باپ کے جسم کانپنے لگتے ہیں، جبکہ بدکاری گلی گلی پھیل رہی ہے، نکاح جیسی فطری نعمت اور ضرورت کس قدر مشکل اور مہنگی ہو چکی ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لئے چند تصویریں دیکھئے:

ایک صاحب مسجد میں بھیک مانگ رہے ہیں، وجہ پوچھیں تو جواب ملے گا کہ گھر میں تین جوان بیٹیاں ہیں مگر انہیں کسی کے نکاح میں دینے کے لئے رِشوت (جہیز) کے پیسے نہیں ہیں۔ یہ صاحب حج نہیں کرتے حالانکہ مال دار ہیں، وجہ پوچھیں تو بتائیں گے کہ دو بچیوں کی شادی کرنی ہے، حج کیسے کریں؟ یہ جوان آدمی جہاد کے لئے تڑپ رہا ہے، مگر نہیں جاسکتا، وجہ پوچھیں تو بتایا جائے گا: اس کی چار جوان بہنیں ہیں، ان کے لئے جہیز اکٹھا کرے یا جہاد پر جائے؟ یہ بوڑھے بزرگ روتے روتے بے ہوش ہو گئے ہیں، معلوم ہوا کہ دِل کا دورہ پڑا ہے، وجہ معلوم کی تو پتہ چلا کہ لڑکی کی شادی قریب ہے، ساری زندگی شرافت اور سفید پوشی سے گزاری تھی، جہیز بھی کافی جمع کر لیا تھا مگر آج لڑکی کے سسرال والوں نے پیغام بھجوایا ہے کہ سلامی میں لڑکے کو گاڑی دینی ہوگی۔ یہ خوبصورت نوجوان کینیڈا کے ایئرپورٹ پر کھڑا خود کو قادیانی لکھوا کر سیاسی پناہ اور نوکری کی بھیک مانگ رہا ہے، اس سے پوچھا گیا کہ آپ تو

مسلمان تھے، نمازی تھے، آج خود کو قادیانی کیوں لکھوا رہے ہو؟ وہ درد کے ساتھ جواب دیتا ہے: گھر میں دو جوان بہنیں ہیں، ان کی شادی قریب ہے، جہیز کی تیاری کرنی ہے، چنانچہ مجبوراً مجھے خود کو قادیانی لکھوانا پڑ رہا ہے۔ یہ ایک شخص کی لاش ہے اس نے خودکشی کرلی ہے، آخر کیوں؟ معلوم ہوا کہ گھر میں جوان بیٹیاں تھیں مگر یہ شخص جہیز تیار نہ کرسکا، بالآخر اس نے خودکشی کرلی۔

یہ سب کیا ہے؟ یہ ساری تصویریں مسلمان ملکوں کی ہر گلی میں بکھری پڑی ہیں، یہ مسلمان لڑکیاں جنھیں کوئی بغیر جہیز کے اپنے گھر رکھنے کو تیار نہیں، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک دامن رُوحانی بیٹیاں ہیں، یہ لولی لنگڑی یا معذور بھی نہیں، پھر انہیں جہیز میں کیوں تولا جاتا ہے؟ اگر خدانخواستہ یہی لڑکیاں، یہی بیٹیاں (دِل تھام کر لکھ رہا ہوں) جسم فروشی کرنے والیاں ہوتیں تو لوگ ان کے قدموں میں مال ڈالتے، ان کو مسکراہٹوں کو خریدنے کے لئے بولیاں لگتیں، مگر یہ پاک بیٹیاں ہیں، عصمت کی دیویاں ہیں، ان کی ایک مسکراہٹ پر غلیظ عورتوں کے لاکھوں ترنم قربان کئے جاسکتے ہیں، ان کی شرافت کی قیمت پوری دُنیا کا مال بھی نہیں بن سکتا، مگر قوم کے بے غیرت، بے شرم، بے ضمیر عناصر ان قیمتی اور پاک رُوحوں کو بکاؤ مال سمجھتے ہیں اور اس وقت تک انہیں اپنے گھر کی دہلیز پر قدم نہیں رکھنے دیتے جب تک وہ جہیز کی رِشوت نہ دیں۔

آج کتنی جوانیاں گھر بیٹھے مرجھا چکی ہیں، آج کتنی عصمتیں سرِ بازار نیلام ہوتی ہیں، آج کتنے نوجوان اپنے ہاتھوں خود کو تباہ کررہے ہیں، آج دیواروں پر لگے ہوئے جنسی بیماریوں کے پوسٹر ہمیں کیا پیغام دے رہے ہیں؟ خدا کی قسم! اگر ہندوؤں کی رسموں کو چھوڑ کر نکاح کو آسان اور سستا نہ بنایا گیا تو ہم اپنی گلیوں سے نہیں گزر سکیں گے، ہر طرف بے راہ روی کا ایسا سیلاب آئے گا جو سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ آج ہمارے مسلمانوں کے ایک طبقے نے لڑکی کو کینسر سمجھ لیا اور جہیز کی لعنت کو گلے کا طوق بنالیا، جبکہ دُوسرے طبقے نے لڑکی کی قیمت مقرر کردی، چنانچہ لڑکی کے مہنگے مہر کے بدلے گاڑیاں خریدی جاتی ہیں، نوجوان سالہا سال کی

محنت کر کے یا حرام کے ہاتھ مار کر لاکھوں روپے کماتے ہیں تا کہ اپنے سسر کو دے کر اپنی بیوی کو پا سکیں، شادی اس طبقے میں بھی مہنگی ہے، مگر یہاں سارا بوجھ لڑکے والوں پر ہے، آخر یہ ظلم کب تک چلتا رہے گا؟

قوم کے ظالم خاموش بازو! تمہیں نکاح کی کیا قدر؟ نکاح کی قدر اس نوجوان سے پوچھو جو اپنے دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگانا چاہتا، نکاح کی قدر اس مسلمان جوان سے پوچھا جو اپنی پاک دامنی کے آبگینے نہیں توڑنا چاہتا، نکاح کی قدر اس نوجوان سے پوچھو جو بیوی کے علاوہ کسی اور چیز سے لذت حاصل کرنا حرام سمجھتا ہے، نکاح کی قدر ان سے پوچھو جو نیک صالح اولاد کے خواہش مند ہیں، نکاح کی قدر اس بے زبان پاک دامن بچی کی آہوں سے پوچھو جو اپنے سر میں ایک سفید بال دیکھ کر دِل تھام لیتی ہے اور اس کی حلال اُمنگوں پر اوس پڑنے لگتی ہے۔

بہو کے مال سے گھر سجانے والو! اور داماد کے مال سے گاڑی خریدنے والو! تمہیں نکاح کی کیا قدر؟ تمہیں تو صرف کافرانہ اور ظالمانہ رسموں کی فکر ہے، کس قدر بے شرمی کا مقام ہے کہ آج کا نوجوان بیوی کے لئے ہوئے پلنگ پر سوتا ہے، اسے اتنی شرم نہیں آتی کہ اس پاکیزگی کی تصویر لڑکی کو بستر اور چارپائی دینا اس کی ذمہ داری ہے، کیونکہ یہ مرد ہے، یہ خاوند ہے، یہ وہ نر جانور نہیں جسے کرائے پر لیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا درد رکھنے والو! اُٹھو محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی تلوار سے ہندوانہ رُسومات کے بت پاش پاش کر دو اور ایسی محنت کرو کہ چند ہی دنوں میں شادی سستی ہو جائے، سہولت سے دستیاب ہونے لگے، اور گناہ اتنا مشکل بن جائے کہ کوئی اس کا تصور بھی نہ کر سکے۔ اللہ کرے امیر المؤمنین مُلّا محمد عمر مجاہد بھی جلد اس بارے میں اعلان فرمائیں اور بوڑھے والدین کے چہرے تفکرات سے اور نوجوان بچوں اور بچیوں کے چہرے اَن گنت خدشات سے پاک ہو جائیں، ذہنی غلامی کی یہ زنجیریں ٹوٹ جائیں اور مسلمان ان داخلی زنجیروں اور طوقوں سے آزاد ہو کر اپنے ان فرائض کو ادا کر سکیں کو پکار پکار مسلمانوں کو اپنی ضرورت سے آگاہ کر رہے ہیں۔ (ضربِ مؤمن)

حفاظتِ قرآن پر ایک واقعہ..... اِمام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے سندِ متصل کے ساتھ ایک واقعہ امیر المؤمنین مأمون کے دربار کا نقل کیا ہے کہ مأمون کی عادت تھی کہ کبھی کبھی اس کے دربار میں علمی مسائل پر بحث ومباحثے اور مذاکرے ہوا کرتے تھے، جس میں ہر اہلِ علم کو آنے کی اجازت تھی، ایسے ہی ایک مذاکرے میں ایک یہودی بھی آ گیا، جو صورت، شکل اور لباس وغیرہ کے اعتبار سے بھی ایک ممتاز آدمی معلوم ہوتا تھا، پھر گفتگو کی تو وہ بھی فصیح و بلیغ اور عاقلانہ گفتگو تھی، جب مجلس ختم ہوگئی تو مأمون نے اس کو بلا کر پوچھا کہ: تم اسرائیلی ہو؟ اس نے اقرار کیا، مأمون نے (امتحان لینے کے لئے) کہا کہ: اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو ہم تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کریں گے۔

اس نے جواب دیا کہ: میں تو اپنے اور اپنے آباء واجداد کے دِین کو نہیں چھوڑتا، بات ختم ہوگئی، یہ شخص چلا گیا، پھر ایک سال کے بعد یہی شخص مسلمان ہو کر آیا اور مجلسِ مذاکرہ میں فقہِ اسلامی کے موضوع پر بہترین تقریر اور عمدہ تحقیقات پیش کیں، مجلس ختم ہونے کے بعد مأمون نے اس کو بلا کر کہا کہ: تم وہی شخص ہو جو سالِ گزشتہ آئے تھے؟ جواب دیا: ہاں! وہی ہوں۔ مأمون نے پوچھا کہ: اُس وقت تو تم نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، پھر اب مسلمان ہونے کا سبب کیا ہوا؟

اس نے کہا: میں یہاں سے لوٹا تو میں نے موجودہ مذاہب کی تحقیق کرنے کا ارادہ کیا، میں ایک خطاط اور خوش نویس آدمی ہوں، کتابیں لکھ کر فروخت کرتا ہوں تو اچھی قیمت سے فروخت ہو جاتی ہیں، میں نے امتحان کرنے کے لئے تورات کے تین نسخے کتابت کئے، جن میں بہت جگہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر دی، اور یہ نسخے لے کر میں کنیسہ میں پہنچا، یہودیوں نے بڑی رغبت سے ان کو خرید لیا، پھر اسی طرح اِنجیل کے تین نسخے کمی بیشی کے ساتھ کتابت کر کے نصاریٰ کے عبادت خانے میں لے گیا، وہاں بھی عیسائیوں نے بڑی قدر ومنزلت کے ساتھ یہ نسخے مجھ سے خرید لئے، پھر یہی کام میں نے قرآن کے ساتھ کیا، اس کے بھی تین نسخے عمدہ کتابت کئے، جن میں اپنی طرف سے کمی بیشی کی تھی، ان کو لے کر جب میں فروخت کرنے

کے لئے نکلا تو جس کے پاس لے گیا اس نے دیکھا کہ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ جب کمی بیشی نظر آئی تو اس نے مجھے واپس کر دیا۔

اس واقعے سے میں یہ سبق لیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی نے اس کی حفاظت کی ہوئی ہے، اس لئے مسلمان ہو گیا۔ قاضی یحییٰ بن اکثم اس واقعے کے راوی کہتے ہیں کہ: اتفاقاً اسی سال مجھے حج کی توفیق ہوئی، وہاں سفیان بن عیینہ سے ملاقات ہوئی، تو یہ قصہ ان کو سنایا، انہوں نے فرمایا کہ: بے شک ایسا ہی ہونا چاہئے، کیونکہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔

یحییٰ بن اکثم نے پوچھا: قرآن کی کونسی آیت میں ہے؟ تو فرمایا کہ: قرآنِ عظیم نے جہاں تورات و انجیل کا ذکر کیا ہے، اس میں تو فرمایا: "بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ" یعنی یہود و نصاریٰ کو کتاب اللہ تورات اور انجیل کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، یہی وجہ ہوئی کہ جب یہود و نصاریٰ نے فریضۂ حفاظت ادا نہ کیا تو یہ کتابیں مسخ و محرّف ہو کر ضائع ہو گئیں، بخلاف قرآنِ کریم کے کہ اس کے متعلق حق تعالیٰ نے فرمایا: "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" یعنی ہم ہی اس کے محافظ ہیں، اس لئے اس کی حفاظت حق تعالیٰ نے خود فرمائی، تو دُشمنوں کی ہزاروں کوششوں کے باوجود اس کے ایک نقطے اور ایک زیر و زبر میں فرق نہ آسکا۔ آج عہدِ رسالت کو بھی تقریباً چودہ سو برس ہو چکے ہیں، تمام دِینی اور اسلامی اُمور میں مسلمانوں کی کوتاہی اور غفلت کے باوجود قرآنِ کریم کے حفظ کرنے کا سلسلہ تمام دُنیا کے مشرق و مغرب میں اسی طرح قائم ہے، ہر زمانے میں لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان جوان، بوڑھے، لڑکے اور لڑکیاں ایسے موجود رہتے ہیں جن کے سینوں میں پورا قرآن محفوظ ہے، کسی بڑے سے بڑے عالم کی بھی مجال نہیں کہ ایک حرف غلط پڑھ دے، اسی وقت بہت سے بڑے اور بچے اس کی غلطی پکڑ لیں گے۔ (قرطبی بحوالہ: معارف القرآن، ج:۵، ص:۲۸۳)

پاکستان کو ڈاڑھی مبارک..... خبروں میں جب یہ سنا کہ جناب محمد رفیق تارڑ پاکستان کے صدر بن گئے ہیں اور ماشاء اللہ باریش آدمی ہیں، تو بہت خوشی ہوئی، عام طور پر بچے کے پیدا ہونے کے پندرہ سولہ سال کے بعد ڈاڑھی آجاتی ہے، اور مردانگی کا یہ حسن اس بچے کے

جوان ہونے کی خوشخبری دیتا ہے۔ بعض ٹھنڈے علاقوں میں ڈاڑھی کچھ دیر سے آتی ہے اور عمومی طور پر اٹھارہ بیس سال کی عمر تک کے نوجوانوں کو یہ نور نصیب ہوتا ہے۔ فطرت پسند نیک لوگ ڈاڑھی آنے کو عقل کی پختگی کی علامت سمجھتے ہیں اور اس نعمت کے ملنے پر خوشی محسوس کرتے ہیں، اسی طرح ماں باپ اپنے بیٹوں کے چہرے پر ڈاڑھی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتے ہیں کہ اب ان کے بچے ماشاءاللہ سمجھ دار اور جوان ہو چکے ہیں اور ان کی عقل پختہ ہو چکی ہے، لیکن اگر پندرہ بیس سال گزرنے پر بھی بچہ دماغی طور پر بالغ اور جسمانی طور پر مضبوط نہ ہو تو اس میں مردانگی اور عقل کی علامات ظاہر نہ ہوں تو ماں باپ اور اہلِ خاندان سخت پریشان ہوتے ہیں، دُعائیں کرواتے ہیں، دوائیاں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے نام کی منتیں مانتے ہیں اور وہ سب کچھ کرتے ہیں جو وہ کر سکتے ہیں۔ ہمارا پیارا ملک پاکستان بھی پچاس برس کا ہو گیا مگر ابھی تک بلوغ اور عقل کی کوئی نشانی اس پر ظاہر نہیں ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ پچاس سال پورے ہونے کے بعد پاکستان بھی قدرے بالغ ہوا ہے اور اسے (اس کے صدر کو) ڈاڑھی کا نور نصیب ہوا، اور بالغ ہوتے ہی پاکستان نے ایٹمی دھماکے کر کے اپنے بلوغ اور عقل مندی کا ثبوت دے دیا، اور دُنیا میں اپنا ایک مقام منوالیا، یہ تو صرف ایک ڈاڑھی کا کمال ہے، ذرا سوچیے کہ اگر پورا ملک بالغ ہو جائے اور پاکستان کا ہر مرد، مرد بن جائے تو اس کی قوّت اور طاقت کا کیا عالم ہوگا۔ (مولانا مسعود اظہر)

قلم کی اہمیت..... قلم اگر دیکھا جائے تو ایک چھوٹا سا لفظ ہے، مگر ذرا غور کریں تو یقین نہیں آتا، پہلے زمانے کے لوگ پرندوں کے پَروں کو سیاہی میں ڈبو کر کپڑے یا دُوسری چیزوں پر لکھا کرتے تھے، لیکن اب تو قلم میں سیاہی بھری اور بس لکھتے ہی چلے گئے۔

انسان جو علم حاصل کرتا ہے وہ قلم کی وجہ سے ہے، اور آج میں قلم میں جو اہمیت بیان کر رہی ہوں وہ اسی قلم کی بدولت ہی ایسا ممکن ہوا ہے، کیونکہ یہی ہماری سوچ کو دُوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے، کسی نے دُرست کہا ہے کہ: ''قلم کی طاقت تلوار سے زیادہ ہے۔''

جن کتابوں سے ہم علم حاصل کرتے ہیں ان کتابوں پر اس کی وجہ سے الفاظ درج ہوتے

ہیں، ورنہ ایک کورا کاغذ ہمیں کیا سکھاتا ہے، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نزول ہوا تو اسے قلم ہی کی بدولت پتوں اور کھالوں پر لکھ کر محفوظ کیا جاتا تھا اور آج اس قرآن کو کتابی شکل دینے والا بھی تو قلم ہی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے قرآن پاک میں فرمایا ہے کہ تیرے رَبّ نے اس قلم کے ذریعے سے سکھایا اور انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کی سورۃ العلق میں جب خود اس کی اہمیت واضح کر دی تو پھر ہمیں اس کو سمجھنے میں کوئی دُشواری پیش نہیں آنی چاہئے۔

قلم الفاظ کو تحریری شکل عطا کرتا ہے، یا یوں کہہ لیں کہ حروف کو جوڑ کر لفظوں کی ایسی مربوط لڑی میں پرو دیتا ہے کہ خیالات کا عکس نہایت دِلکش اور پُر لطف صورت اختیار کر لیتا ہے۔

قرآن مجید کے چیلنج کا جواب قیامت تک نہیں ہوسکتا..... قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کی دلیل ''آفتاب آمد دلیل آفتاب'' کے طور پر خود قرآن مجید میں موجود ہے، اور وہ دلیل اس کا ''اعجاز'' ہے، جس کے لئے قرآن مجید میں تین مقامات پر بطور تدریج اپنا چیلنج بیان کیا ہے جن کے ذریعے ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو ''قرآن'' کو کلام اللہ نہیں مانتے ہیں، ان سے کہا گیا ہے کہ اگر تم قرآن کو کلام اللہ نہیں مانتے ہو تو اس قرآن کے مثل کوئی دُوسری کتاب بنا کر اس کے مقابلے میں لے آؤ، اور اگر یہ نہ کر سکو تو چلو اس جیسی دس سورتیں ہی بنا کر پیش کر دو، اور اگر اتنا بھی نہ کر سکو تو اس کی ایک ہی سورت جیسی کوئی ایک سورت بنا لاؤ۔

نزولِ قرآن مجید کو چودہ سو سال سے زیادہ وقت گزر گیا مگر قرآن مجید کے اس چیلنج کا جواب کسی سے بھی نہ ہوسکا۔ (آئینۂ مظاہر علوم)

نکاح کے لئے انتخاب کا معیار..... عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ حدیث کے مشہور اِمام گزرے ہیں، ان کے وسیع علم، تقویٰ اور نیکی کی گواہی دیتے ہوئے حضرت ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ابن مبارک نیکی، حسنِ عبادت، خلوص، وسعتِ علم، جذبۂ جہاد، غم خواری، جواں مردی، راہِ حق میں اِستقامت اور دُوسری تمام اخلاقی خوبیوں میں ممتاز ہیں، اور خدا گواہ ہے

کہ ان کی انہیں خوبیوں کی وجہ سے میں ان سے محبت کرتا ہوں اور صرف اللہ کی خاطر ان سے محبت کرتا ہوں، ان کی محبت سے مجھے بھلائی کی اُمید ہے۔''

حضرت عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کے والد حضرت مبارک رحمۃ اللہ علیہ ایک دولت مند کے باغ کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے، مالک ان کی دیانت اور لیاقت کی وجہ سے ان سے بہت ہی خوش تھے، ایک دن مالک نے ان کی کارگزاری سے خوش ہوکر ان کو اپنے پاس بلایا اور کہا: ''مبارک! میں یہ چاہتا ہوں کہ کل سے تم باغ کی دیکھ بھال تو کسی دُوسرے آدمی کے سپرد کردو اور میری صحبت میں میرے ساتھ رہا کرو۔'' مبارک رحمۃ اللہ علیہ خاموش رہے تو مالک نے کہا: ''مبارک! میں نے سوچ سمجھ کر تمہیں یہ اعزاز دیا ہے، تمہارے پاس باغ کی نگرانی کے لئے کئی آدمی ہیں، تم جس ک مناسب سمجھو یہ ذمہ داری سونپ دو اور کل سے میری مجلس میں بیٹھا کرو۔''

مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے چلے آئے، اور دُوسرے دن باغ کی نگرانی ایک دُوسرے آدمی کے سپرد کر کے مالک کی مجلس میں بیٹھنے لگے، اب تو مبارکؒ کے جوہر اور کھلنے لگے، اور باغ کے مالک ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ گھریلو کام میں بھی ان سے ضرور مشورہ لیتے اور مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔

ایک دن باغ کے مالک کچھ فکرمند تھے، مبارکؒ سمجھ گئے کہ ضرور آج ان کو کوئی پریشانی لاحق ہے، پوچھا: حضور! کیا بات ہے؟ آج آپ کچھ فکرمند نظر آرہے ہیں؟

جی ہاں! آج ایک مسئلے میں میرا ذہن اُلجھا ہوا ہے، اور تم سے اس معاملے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ اور مالک نے رازداری کے ساتھ مبارکؒ کے سامنے مشوریے کے لئے اپنا مسئلہ رکھا۔

بھائی بات یہ ہے کہ لڑکی جوان ہوگئی ہے اور اس کے پیغام آنے لگے ہیں، میں بھی چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اس کی شادی کردُوں، پیغام کئی ہیں، سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کس پیغام کو قبول کروں اور کس کا انکار کردُوں۔

مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے غور سے اپنے مالک کی باتیں سنیں، پھر فرمایا: اس کا فیصلہ کرنا تو کوئی ایسی دُشوار بات نہیں ہے، جاہلیت کے دور میں عرب کے لوگ تو حسب نسب کو دیکھتے تھے، یہود مال و دولت پر جان دیتے ہیں، اور نصاریٰ حسن و جمال پر جان چھڑکتے ہیں، مگر اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ دِین واخلاق کو ترجیح دی جائے، اب آپ آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ آپ کے نزدیک قابلِ ترجیح کیا چیز ہے؟

مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی یہ باتیں سن کر مالک بہت خوش ہوئے، دِل ہی دِل میں ان کی دانائی اور عقل مندی کی تعریف کی، فوراً گھر گئے، اپنی بیوی کو پورا واقعہ سنایا، بیوی نے بھی مبارکؒ کے عاقلانہ مشورے کی تعریف کی، مالک نے بیوی کو بھی متوجہ پایا تو بولے: میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی پیاری بیٹی کا نکاح مبارک سے کر دُوں، ایسا دیانت دار، عقل منداور خدا ترس نوجوان ملنا مشکل ہے۔

ارے یہ کیا، غلام سے اپنی بیٹی کا نکاح! بیوی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

کیوں کیا بات ہے؟ کیا دِین واخلاق میں وہ سب سے افضل نہیں ہے؟ کیا اسلام نے نکاح کے لئے یہ معیار بتا کر کوئی غلطی کی ہے؟ خدا کے رسولؐ نے جب یہ ہدایت دی ہے کہ نکاح کے انتخاب میں دِین واخلاق کو دیکھو، تو یقیناً یہی بات صحیح ہے، اسی میں دِین و دُنیا کی بھلائی ہے، اب مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیوی بھی راضی ہوگئیں اور باغ کے مالک کی چاندسی لڑکی کا نکاح مبارکؒ کے ساتھ کر دیا گیا۔ اسی لڑکی سے مبارکؒ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، باپ نے اس کا نام ''عبداللہ'' رکھا اور یہی وہ عبداللہ بن مبارکؒ ہیں جو آسمانِ حدیث پر سورج بن کر چمکے۔

حقیقتِ حسن.....

خدا سے حسن نے اِک روز یہ سوال کیا
کیوں نہ تو نے مجھے دُنیا میں لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دُنیا

شب دراز عدم کا فسانہ ہے دُنیا
ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتادی زمین کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
کلی کا ننھا سا دِل خوں ہوگیا غم سے
چمن سے روا ہوا موسمِ بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

(اقبالؒ)

ایک اہم تاریخی واقعہ (جسے دیکھ کر ایک لاکھ ساٹھ ہزار تاتاری مسلمان ہوگئے).....چھٹی صدی ہجری میں تاتاری اپنے علاقے سے نکل کر ترکستان سے لے کر سارے وسط ایشیا تک چھا گئے۔ منگولیا کے یہ وحشی قبائل جو جنگلی جانوروں کا گوشت کھاتے تھے اور لباس کے طور پر ان کی کھال اوڑھ لیتے تھے، اسلامی دُنیا پر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ بے شمار مسلمانوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر ڈالا اور بڑے بڑے متمدن شہروں کو خاکستر بنا ڈالا۔ اس زمانے میں تاتاریوں کا رُعب اس قدر طاری تھا کہ ایک نہتا تاتاری راستے میں ایک مسلمان کو پکڑتا اور کہتا کہ: ''یہیں ٹھہرو! میں گھر سے ہتھیار لے کر آتا ہوں تو تم کو قتل کرڈوں گا'' وہ تلوار لینے چلا جاتا اور مسلمان کو یہ ہمت نہ ہوتی کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ ایک ایک تاتاری سو سو مسلمانوں کو اس طرح ہنکا کر لے جاتا تھا جس طرح چرواہا ریوڑ کو ہنکا کر لے جاتا ہے۔ ان کی قوت اس قدر ناقابلِ تسخیر سمجھی جانے لگی

کہ یہ مقولہ ضرب المثل بن گیا: ''اگر تم سنو کہ تاتاری شکست کھا گئے تو اس خبر پر یقین نہ کرنا'' مگر یہی ناقابلِ تسخیر سیلاب صرف ایک کلمۂ ایمان سے فرو ہو گیا۔ تاتاریوں نے علماء و محدثین کی ایک جماعت کو قراقرم میں بے دخل کر دیا تھا، انہیں میں ایک باخدا بزرگ شیخ جمال الدین بھی تھے، یہ بزرگ کاشغر سے دو سو کلومیٹر دُور بجانب مشرق ''آقاسو'' کی آبادی میں سفر کر رہے تھے، انہیں دنوں اتفاق سے ایک تاتاری شہزادہ تغلق تیمور خان یہاں کے شکار کے لئے آیا ہوا تھا، اس کا حکم تھا کہ رعیت کے تمام لوگ اس کے ساتھ شکار میں شریک ہوں، چنانچہ علاقے کی پوری آبادی اس کے ہم رکاب تھی، یکا یک اس کی نظر شیخ جمال الدین اور ان کے رفیق پر پڑی جو ایک گوشے میں بیٹھے آرام کر رہے تھے، تیمور نے حکم دیا کہ انہیں اس کے سامنے حاضر کیا جائے، میرا حکم ہے کہ ساری رعایا میرے ساتھ چلے، پھر تم میرے حکم کے خلاف یہاں کیوں بیٹھے ہو؟ خان نے غصّے میں کہا، ''ہم پردیسی ہیں اور ہمیں آپ کے حکم کا بالکل علم نہ تھا'' شیخ نے جواب دیا، اس عذر کو سننے کے بعد خان نے انہیں چھوڑ دیا مگر اپنے ایک شکاری کتے جسے وہ خنزیر کا گوشت کھلا رہا تھا اشارہ کر کے کہنے لگا: ''او بڈھے! بتا کہ تو اس کتے سے اچھا ہے یا کتا تجھ سے اچھا ہے؟'' شیخ نے جواب دیا: ''اگر مجھ میں ایمان ہے تو میں اچھا ہوں، ورنہ کتا مجھ سے اچھا ہے۔'' یہ جواب تاتاری شہزادے کے دِل پر اثر کر گیا، اس نے ایک امیر کو حکم دیا کہ اس شخص کو اپنے گھوڑے پر سوار کر کے میرے خیمے میں لے آؤ۔ شیخ جمال الدین جب تغلق تیمور خان کے خیمے میں آئے تو اس نے پوچھا کہ: ''وہ کیا چیز ہے جو اِنسان کو کتے سے بہتر بناتی ہے؟'' ''اسلام'' اور پھر اسلام کی حقیقت اس طرح بیان کی کہ بے اختیار رونے لگا، آخر میں اس نے کہا: ابھی میرے اختیارات محدود ہیں، جب میں تخت پر بیٹھوں اس وقت ضرور میرے پاس آنا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس وقت میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ شیخ جمال الدین نے واپس آ کر اپنے بیٹے ارشد الدین کو سارا قصہ سنایا اور ان کو وصیت کی کہ اگر میں تغلق تیمور خان کی مسند نشینی سے پہلے مر جاؤں تو اس سے مل کر قبولِ اسلام کا قصہ ضرور یاد دِلا دینا۔ اس وصیت کے کچھ ہی دن بعد شیخ جمال الدین کا انتقال ہو گیا۔

۱۳۴۷ء میں اُمرائے دولت کے مشترکہ فیصلے کے تحت تغلق تیمور خان کو منگولستان (منگولیا) کا خاقان تجویز کیا گیا اور وہ بڑے کر وفر کے ساتھ حکومت کے تخت پر بیٹھا، شیخ ارشدالدین یہ خبر سنتے ہی پایۂ تخت کی طرف روانہ ہو گئے مگر کئی روز تک خاقان کے دربار تک رسائی نہ ہوسکی، آپ ہر روز صبح کے وقت خاقان کے خیمے کے قریب پہنچ جاتے اور پو پھٹتے ہی اس قوت سے اَذان دیتے کہ ساری وادی گونج اُٹھتی، آخر ایک دن جبکہ خاقان کی نیند ان کی اَذان کی آواز سے اُچاٹ ہوگئی تھی، اس نے حکم دیا کہ اس بے ادب شخص کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔

''تم کون ہو جو ہر روز منہ اندھیرے آکر ہمارے خیمے کے پاس چلاّنے لگتے ہو؟'' میں اس شخص کا بیٹا ہوں، شیخ ارشدالدین نے کہنا شروع کیا، جسے آپ نے ایک موقع پر اسلام قبول کرنے کا قول دیا تھا، میرے باپ کا انتقال ہو چکا ہے اور اب میں مرحوم کی وصیت کے مطابق آپ کو یاد دِلانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

تغلق تیمور خان کو اپنا وعدہ یاد آ گیا بستر سے اُٹھ کر مسند پر آ بیٹھا اور شیخ کو پوری عقیدت کے ساتھ اپنے پہلو میں جگہ دی، اس کے بعد کہا: ''میں تخت نشینی کے وقت سے آپ کا منتظر ہوں، اب آپ آ گئے ہیں تو بتایئے میں کیا کروں؟'' شیخ نے تغلق تیمور خان کو غسل کرنے کے لئے کہا، پھر کلمہ پڑھا کر اس کو مسلمان کیا۔

اب شیخ کے مشورے کے مطابق خاقان نے مغولستان میں اسلام کی اشاعت شروع کی، پہلے اس نے ایک ایک اَمیر کو الگ الگ بلا کر دِینِ حق کی دعوت دی، اس طرح بہت سے اَمیر مسلمان ہو گئے، آخر میں جب اَمیر جبر اس کو دعوت دی گئی، تو اس نے بڑی نازک صورت پیدا کر دی، اس نے یہ شرط پیش کی کہ اگر شیخ راشدالدین میرے پہلوان ساتغنی بقا کو کشتی میں پچھاڑ دیں تو میں اسلام قبول کرلوں گا۔ خاقان نے ہر چند اس شرط کو ختم کرنا چاہا، مگر اَمیر راضی نہیں ہوتا تھا، اس اثناء میں شیخ ارشدالدین کھڑے ہو گئے اور کہا: ''مجھے اَمیر کی شرط منظور ہے'' ان الفاظ کو سنتے ہی خاقان کے دربار میں سناٹا چھا گیا، اَمیر جبر اس خوشی سے اُچھل پڑا،

دُوسری طرف خاقان کا دِل بجھ گیا۔ ساتغنی بقا ایک انتہائی قوی اور زور آور پہلوان تھا، خاقان نے سوچا کہ شیخ کو چونکہ اس کی بابت کچھ علم نہیں ہے اس لئے انہوں نے شرط منظور کر لی، حالانکہ ان جیسا کمزور آدمی کبھی بھی اس دیو ہیکل پہلوان کے مقابلے میں ٹھہر نہ سکے گا، اور اس طرح ان کی شکست سے اسلام کو شکست ہو جائے گی۔

مگر شیخ ارشدالدین بھری مجلس میں الفاظ ہار چکے تھے، اب خاقان کے لئے رضامندی کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہا تھا۔ ملک کے تمام طول وعرض میں ساتغنی بقا اور شیخ ارشدالدین کی کشتی کا اعلان کر دیا گیا، امیر جبراس نے اس دنگل کے اِشتہار میں اپنی زیادہ سے زیادہ طاقت صَرف کر دی، ایک بہت بڑا مقام اس کشتی کے لئے تجویز ہوا، کشتی سے کئی دن پہلے خاقان کا صدر مقام ہجومِ خلائق سے بھر گیا، تمام اُمراء آئے اور تمام گورنر آئے، تمام عہدے دار آئے، ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو گئے اور خود اَمیر جبراس بڑی شان کے ساتھ میدان میں آیا، مغولستان کا سب سے بڑا پہلوان ساتغنی بقا بھی اس کے ساتھ تھا۔

شاہی نقارے پر چوٹ پڑی اور لوگوں نے دیکھا کہ امیر جبراس کا پہلوان میدان میں مست ہاتھی کی طرح کھڑا ہوا ہے، دُوسری طرف سے ایک کمزور اور نحیف فقیر نکلا، تماشائیوں نے اپنی سانسیں روک لیں، مسلمان دُعاؤں میں مشغول ہو گئے، اب دونوں پہلوان ایک دُوسرے کے بالکل قریب آ گئے تھے۔

دفعۃً شیخ ارشدالدین کے جسم میں حرکت ہوئی اور انہوں نے تیزی سے ایک ہاتھ اُٹھا کر ساتغنی بقا کو ایک طمانچہ رسید کیا، خدا کے حکم سے یہ قضا کا طمانچہ بن گیا، ساتغنی بقا اسی وقت زمین پر گرا اور فوراً مر گیا۔

مسلمانوں نے دیکھ کر اس وقت اور شدت سے نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ دشت وجبل گونج اُٹھے، کفر واسلام کی کشتی خدا کے حکم سے ایک ہی منٹ میں ختم ہو گئی، اس وقت جتنے بھی لوگ میدان میں جمع تھے سب کے سب خدا کے آگے جھک گئے، شام ہوتے ہوتے ایک لاکھ ساٹھ ہزار تاتاریوں نے اسلام قبول کر لیا، اس طرح ایک شخص کی ایمانی قوّت نے اس مہیب اور

عظیم مسئلے کو حل کر دیا جس کو حل کرنے کے لئے تمام مادّی تدبیریں ناکام ہو چکی تھیں۔ جب تاتاری مسلمان ہو گئے تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی کارروائیاں بھی خود بخود ختم ہو گئیں، وحشی تاتاریوں کو فوج شکست نہ دے سکی تھی، مگر اسلام کی قوّت نے انہیں جیت لیا۔

ہماری خود اپنی تاریخ کا یہ صفحہ ہمیں ایک عظیم سبق دیتا ہے، وہ سبق یہ ہے کہ ایک کمزور ترین آدمی بھی سخت ترین قوّت کے مقابلے میں بازی جیت سکتا ہے مگر کب؟ اس وقت جبکہ اس کے اندر ایمان کی طاقت پیدا ہو جائے۔ (رسالہ ختم نبوت)

گانے بجانے کی حرمت..... حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اس اُمت میں زمین میں دھنسنے اور شکلیں بگڑنے اور آسمان سے پتھر برسنے کا عذاب نازل ہوگا'' کسی صحابی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ایسا کب ہوگا؟ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب گانے بجانے، ناچنے والی عورتیں اور گانے بجانے کا سامان ظاہر ہو جائے گا، اور لوگ شرابیں اُڑائیں گے۔'' (ترمذی شریف، ج:۲، ص:۵۴)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ایک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص سے گانے کی آواز سنی تو فرمایا کہ: ''اس کی نماز مقبول نہیں'' تین مرتبہ یہی ارشاد فرمایا۔ (جواہر الفتاویٰ، ج:۱، ص:۳۴۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''گانا بجانا، سننا (بڑا) گناہ ہے، اور سننے سے بچو! اس لئے کہ یہ دِل میں اس طرح نفاق پیدا کرتے ہیں جس طرح کھیتی کو پانی اُگاتا ہے، گانا سننا اور اس کے پاس بیٹھنا فسق ہے، اور اس گانے سے لذت حاصل کرنا، لطف اندوز ہونا کفر ہے۔'' (رَدّ المحتار، ج:۵، ص:۲۲۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''میں بانسریاں اور گانے بجانے کے سامان کو توڑنے کے لئے بھیجا گیا ہوں۔'' (مشکوٰۃ، جواہر الفتاویٰ، ج:۱، ص:۳۴۸)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل ہے کہ: ''جو شخص گانا کرے (مغنیہ یا باندی کا) تو قیامت کے دن اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔'' (جامع صغیر، ص:۱۶۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کے گانے کی آواز سنی، ان میں ایک شعر پڑھ رہا تھا، دُوسرا اس کا جواب دے رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''دیکھو! یہ کون لوگ ہیں؟'' لوگوں نے عرض کیا کہ فلاں فلاں آدمی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے بددُعا فرمائی اور فرمایا: ''اے اللہ! انہیں جہنم میں اُلٹ دے، اور آگ میں دھکیل دے۔'' (مجمع الزوائد، ج:۸، ص:۱۶۸)

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کی ایک گلی سے گزر رہے تھے، تو ایک نوجوان قریب سے گانا گاتا ہوا گزرا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مخاطب کر کے فرمایا کہ: ''نوجوان! تم پر افسوس ہے کہ تم قرآن مجید ترنم سے کیوں نہیں پڑھتے؟'' یہ جملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی دفعہ دُہرایا۔ (اسلام اور قوالی، ص:۲۲۷)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ''دو آوازیں ایسی ہیں کہ جن پر دُنیا و آخرت میں لعنت کی گئی ہے، ① خوشی کے وقت گانا بجانا وغیرہ، ② مصیبت کے آہ و بکاء کرنا و نوحہ وغیرہ کرنا۔'' (بیہقی، کنز العمال، ج:۷، ص:۳۳۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ: ''آخر زمانے میں میری اُمت کے کچھ لوگ بندر اور خنزیر کی شکل میں (مسخ یعنی تبدیل) ہو جائیں گے'' صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا وہ اللہ کی توحید اور آپ کی رسالت کا اقرار کرتے ہوں گے؟ ارشاد فرمایا: ''ہاں! وہ نماز روزہ اور حج بھی کریں گے'' صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! پھر ان کا یہ حال کیوں ہوگا؟ ارشاد فرمایا کہ: ''آلاتِ موسیقی (گانے بجانے کا

سامان)، رقاصہ عورتوں (کنجریوں) اور طبلہ اور سارنگی وغیرہ کے شیدائی ہوں گے، اور شرابیں پیا کریں گے اور رات بھر اسی کام میں مصروف رہیں گے، اور صبح ہوئی تو بندر اور خنزیروں کی شکل میں تبدیل ہو چکے ہوں گے۔'' (فتح الباری، ج:۱۰، ص:۹۴)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص گانا سنتا رہے، جنت کے قاریوں کی آواز سننے سے روک دیا جائے گا۔'' جنت میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُمت کو قرآنِ کریم سناویں گے بلکہ خود اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو قرآن سنائیں گے، لیکن وہ آدمی جو گانے سننے والا ہوگا، محروم رہے گا۔ (کنز العمال، ج:۷، ص:۳۳۳)

گانے سننا دِینِ اسلام کے ساتھ غداری اور تقابل بھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں کو قرآن پاک سناتے تھے تو ایک کافر جس کا تذکرہ سورۂ لقمان میں کیا گیا ہے وہ کافر کنجریاں اور ناول وغیرہ اپنے گھر میں لے آیا کہ لوگ قرآن پاک نہ سنیں، اور میرے گھر میں کنجریوں سے گانے اور کہانیاں سنیں گے، آج بھی گانے بجانے کا سامان فراہم کرنا یہ سب قرآن پاک پڑھنے اور سننے سے روکنے کے مترادف ہے، اس مرض میں عوام و خواص کی اکثریت مبتلا ہے، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس سے محفوظ فرمائیں، آمین ثم آمین!

سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ کا عدل و انصاف..... ایک رات سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۴۲۱ھ) سو رہا تھا کہ یکا یک اُس کی آنکھ کھل گئی، پھر لاکھ چاہا کہ دوبارہ نیند آجائے، مگر نیند کوسوں دُور نکل چکی تھی، بستر پر تڑپتا اور کروٹیں بدلتا رہا، جب کسی طرح آنکھ نہ لگی تو اِس خدا ترس بادشاہ کو خیال آیا کہ شاید کوئی مظلوم فریاد لایا ہے، یا کوئی فقیر بھوکا آیا ہے، اسی لئے اس کی نیند اُچٹ گئی، غلام کو حکم دیا: ''باہر جا کر دیکھو کون ہے؟'' غلام نے باہر جا کر دیکھا تو کوئی نہ تھا، واپس آکر کہا: ''جہاں پناہ! کوئی شخص نہیں'' محمود نے پھر چاہا کہ سو رہے، مگر نیند نہ آنی تھی، نہ آئی، وہی بے چینی اور گھبراہٹ پیدا ہوگئی، غلاموں کو دوبارہ کہا: ''اچھی طرح دیکھ آؤ کون داد خواہ آیا ہے؟'' غلام دوڑے ہوئے گئے، اِدھر اُدھر دیکھا اور واپس آکر بولے: ''حضور! کوئی نہیں ہے۔'' سلطان کو شبہ ہوا شاید غلام تلاش کرنے سے جی چراتے ہیں، غصے

میں خود کھڑا ہوا اور تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے باہر آ گیا، بہت تلاش کی، مگر کوئی شخص نظر نہ آیا، قریب ہی ایک مسجد تھی، اُس کے دروازے پر آ کر اندر کی طرف جھانکا تو آہستہ آہستہ کسی کے رونے کی آواز آئی، قریب پہنچ کر دیکھا تو ایک شخص فرش پر پڑا ہوا نظر آیا، اُس کا منہ زمین سے لگا ہوا تھا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے، آہیں بھر رہا تھا اور چپکے چپکے کہہ رہا تھا ؎

اے کہ از غم نہ دیدۂ خواری　　از غمِ ما کجا خبر داری
خفتہ ماندی چو بخت ما ہمہ شب　　تو چہ دانی زِ رنج بیداری

پھر کہنے لگا کہ: سلطان کا دروازہ بند ہے تو کیا سبحان کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، اگر محمود ولی سو رہا ہے تو حرج نہیں مبعودِ ازلی تو جاگ رہا ہے۔ محمود یہ سن کر اُس کے بالکل قریب پہنچ کر بولا: محمود کی شکایت کیوں کرتا ہے؟ وہ تو ساری رات تیری تلاش میں بے چین رہا، بتا تجھے کیا تکلیف ہے؟ کس نے ستایا ہے؟ کہاں اور کس غرض سے آیا ہے؟ یہ سن کر وہ شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا بولا: ''حضور! ایک درباری کے ہاتھوں ستایا ہوا آیا ہوں، مگر اُس کا نام نہیں جانتا، اُس نے میری عزت خاک میں ملا دی، آدھی رات کو مستی کے عالم میں میرے گھر آتا ہے اور میری شریکِ زندگی کی عصمت کو داغ دار کرنے کی کوشش کرتا ہے، اگر آپ نے اِس تلوار کی آب سے اس داغ کو نہ دھویا تو کل قیامت کے دن میرا ہاتھ ہوگا اور آپ کا گریبان!'' یہ سن کر محمود کو مذہبی غیرت اور شاہی حمیت کے جوش سے پسینہ آ گیا، غصّے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا: ''بتا! کیا اس وقت بھی وہ ملعون وہیں ہوگا؟'' اُس شخص نے جواب دیا: ''اب تو بہت رات گزر گئی، شاید چلا گیا ہو، لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ پھر آئے گا۔'' سلطان نے کہا: ''اچھا! اس وقت تو جاؤ، مگر جس روز، جس وقت وہ آئے مجھے فوراً اطلاع کرو۔'' اُس شخص نے سلطان کو دُعا دی اور رُخصت ہو کر چلا ہی تھا کہ سلطان نے ٹھہرنے کا حکم دیا، اور پہرہ داروں سے کہا کہ: ''دیکھو! یہ جس وقت بھی آئے، خواہ میں سوتا ہوں یا جاگتا ہوں، فوراً اس کو مجھ تک پہنچاؤ۔'' اتنا کہہ کر محمود اندر آیا، اور وہ شخص اپنے گھر چلا گیا۔ تیسری رات وہ شخص شاہی محل سرا کے دروازے پر پہنچا، پہرے داروں نے اس کی شکل دیکھتے ہی سلطان کی خدمت

میں پہنچا دیا۔ سلطان جاگ رہا تھا، تلوار لے کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا: ''چلو! راتوں کو اِس شکار کرنے والی لومڑی تک مجھے لے چلو'' یہ سن کر وہ شخص آگے ہولیا اور سلطان اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا، گھر پہنچ کر اُس شخص نے سلطان کو وہ جگہ بتائی جہاں وہ ظالم شخص خزانے کا سانپ بنا ہوا سو رہا تھا، سلطان نے تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ ایسا جمایا کہ تمام فرش پر انصاف کا لالہ زار کھل گیا، اس کے بعد سلطان مڑا اور مظلوم صاحبِ خانہ کو بلا کر فرمایا: ''اَب تو محمود سے خوش ہو!'' یہ کہہ کر محمود نے مصلیٰ منگوایا، ایک طرف بچھا کر دو رکعت شکرانہ کی نماز پڑھی، پھر اس شخص سے مخاطب ہو کر پوچھا: ''گھر میں کچھ کھانے کو ہو تو لاؤ'' اُس شخص نے جواب دیا: ''ایک چیونٹی سلیمان کی کیا خاطر کر سکتی ہے، جو کچھ ہے حاضر کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر دسترخوان ڈھونڈ کر سوکھی روٹی کے کچھ ٹکڑے لئے ہوئے آیا اور سلطان کے سامنے رکھ دیئے۔ سلطان نے اس درجہ رغبت اور شوق سے یہ ٹکڑے کھائے کہ شاید عمر بھر میں کوئی لذیذ غذا اس طرح نہ کھائی ہوگی، کھانے سے فارغ ہو کر سلطان نے اس شخص سے کہا: ''معاف کرنا! میں نے تمہیں کھانے کے لئے تکلیف دی، لیکن سنو! بات یہ ہے کہ جس روز تم ملے اور اپنا دُکھڑا سنایا، اس وقت سے میں نے قسم کھالی تھی کہ جب تک اس خبیث کے سر کو اُس کے شانے سے جدا کر کے تمہارے گھر کو پاک نہ کر دُوں گا، رزق کو حرام سمجھوں گا، پھر دو رکعت نماز میں نے شکرانہ میں پڑھی جس پر تم حیران ہو رہے ہو گے، لیکن سنو! اس شخص کے متعلق مجھے اندیشہ تھا کہ میرے بیٹوں میں کوئی ہوگا، میں اپنے دِل میں کہتا تھا کہ میرے درباریوں اور مصاحبوں کو اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے مزاج سے واقف ہوتے ہوئے ایسی حرکت کریں، میں جس قدر زیادہ سوچتا گیا اسی قدر میرا یقین بڑھتا گیا کہ اتنی بڑی گستاخی کی ہمت صرف بادشاہ کی اولاد کو ہو سکتی ہے، کیونکہ یہ عام طور پر غرور کے نشے میں مست رہتے ہیں، چنانچہ میں تمہارے ساتھ یہاں اپنے کسی فرزند کو قتل کرنے کے ارادے سے آیا تھا، جب میں نے صورت دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہ میرا فرزند نہیں، کوئی غیر شخص ہے، اس لئے میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔'' (جوامع الحکایات ولوامع الروایات از سدید الدین محمد عوفی، ورق: ۹۴، قلمی نسخہ، دارالمصنفین، نیز دیکھو اُردو ترجمہ جلد اوّل شائع کردہ انجمن ترقی

اُردو: ۳۸-۴۱، ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں، حصہ:۲، ص:۱، تاریخ فرشتہ، ج:۱، ص:۱۴۵)

الجہاد فی الاسلام.....

"ذٰلک قولھم بأفواھھم یضاھئون قول الذین من قبلھم، قاتلھم اللہ أنّٰی یؤفکون." ..... ترجمہ: "یہ ان لوگوں کی اُڑائی ہوئی گپ ہے، جو ان کافروں کی طرح گپیں ہانکتے ہیں جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں، اللہ ان کو غارت کرے، یہ کیسے بھٹکے چلے جارہے ہیں۔"

کہتے ہیں کہ لفظ اور معنی میں جسم اور رُوح کا سا تعلق ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے الفاظ دُنیا میں ایسے موجود ہیں جن کے معانی کچھ نہیں مگر ان کی تأثیر طبائع پر سخت و شدید ہے، من جملہ ایسے ہی لفظوں میں لفظِ "جہاد" بھی ہے، جس کو ہمیشہ یورپ نے خوف دہشت سے سنا ہے، اس لفظ کے سنتے ہی ایک مسیحی کا تمام جسم شدتِ ہراس سے کانپ اُٹھتا ہے، اس کا دِماغ مختل ہو جاتا ہے، اس کی نبض کی حرکت اَسّی ۸۰ سے ایک سو ۱۸۰ اَسّی تک پہنچ جاتی ہے، اس کی آنکھوں میں سکراتِ موت کی مردنی چھا جاتی ہے، اس کا سرخ و سفید چہرہ، جس کی رنگت کو اپنے قومی شرف و امتیاز کا ایک خلقی جوہر سمجھتا تھا، موت کے خوف سے سیاہ پڑ جاتا ہے، کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ بے امان عربوں کے جھنڈ اور وحشی باشندوں کے غول، اپنے خون فشاں نیزوں کو بلند کئے اور خونریز تلواروں کو حرکت دیتے ہوئے آرہے ہیں، جن کے سروں پر ایک سرخ علَم لہرا رہا ہے اور اس پر آگ کے حرفوں میں لکھا ہوا ہے: "ہر غیر مسلم کو قتل کر دو، اس لئے کہ وہ مسلم نہیں ہے" الفاظ کی تأثیر پر اگر بحث کی جائے تو "جہاد" سے بڑھ کر کون سا لفظ مل سکتا ہے جس کی افسوں گرانہ حکومت انسانی دِماغ و اعصاب پر اس درجہ مؤثر ہے۔

اسلام کے متعلق یورپ کے تمام خیالات و تصورات کو ہمیشہ جہل اور غلط فہمی سے تعمیر کیا گیا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ دُنیا میں قوموں اور ملکوں کے باہمی تنازعات اور اختلافات کی ایک غالب ملت سوءِ تفہم بھی ہے، اگر کوئی مصلح صلح دامن دُنیا میں آنے والا ہے تو یقیناً اس کا اصلی کام یہ ہوگا کہ قوموں کے چہروں پر سے غلط فہمیوں کی نقاب اُٹھا دے، اور ہر گروہ کو اس کی

اصلی صورت میں ظاہر کردے، لیکن ہم ایک لمحے کے لئے بھی یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ آج یورپ کی وہ قومیں جن کی نوآبادیوں نے مشرق میں مشرقیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے، اسلام اور مسلمانوں سے اس درجہ بے خبر ہیں کہ ان کے صدہا صریح اتہامات کا اصلی سبب صرف سوءِ تفہیم اور عدمِ واقفیت قرار دیا جائے۔ گبن، باسورتھ، اسمتھ اور کاستری ہم کو بتلاتے ہیں کہ ان غلط فہمیوں میں یورپ کے مبتلا ہونے کے لئے تعصب اور جہل کے کیسے مجبور کن اسباب موجود تھے جو صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں قائم ہوگئی تھی، ہم اسے تسلیم کرتے ہیں، لیکن کیا بیسویں صدی میں بھی یورپ اپنے تئیں مذہبی تعصب کا شکار تسلیم کرنے کے لئے آمادہ ہے؟ اور مشرق و مغرب کے اتصال کی موجودہ زندگی میں بھی اس کے پاس عذرِ جہل موجود ہے؟

آج رُوس، فرانس اور انگلستان کی حکومتیں افریقہ اور ایشیا کے سب سے بڑے علاقوں پر قابض ہیں، مسلمانوں کے بڑے بڑے شہر یورپ کی نوآبادیاں بن گئے ہیں، جن میں دو تہائی صدی سے ہر طبقہ اور ہر درجے کے لاکھوں یورپین آباد ہیں، اسلام محکوم اور حاکم دونوں صورتوں میں یورپ کے سامنے ہے، قسطنطنیہ میں مسجدوں کے میناروں کے ساتھ گرجوں کے کلس اس طرح مخلوط ہیں کہ پیرا کے کسی ہوٹل کی کھڑکی میں بیٹھ کر یورپین سیاح کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ جامعہ احمد اور ارمنی چرچ کے کلسوں میں جلد امتیاز کر لے، پھر کیا کسی فرانسیسی نے الجیرہ میں کبھی بھی یہ دیکھا ہے کہ کسی افریقی عرب نے کسی عیسائی تاجر کے محض اس کے عیسائی ہونے کی وجہ سے خنجر جھونک دیا ہو؟ ہندوستان کی کسی انگریزی عدالت میں آج تک کوئی مقدمہ ایسا پیش ہوا ہے جس میں محض تعمیل حکمِ جہاد کے لئے کوئی انگریز قتل کر ڈالا گیا ہو؟ مسلمان نماز پڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، اپنے مذہبی جذبات میں اب تک ایسے سخت و شدید ہیں کہ ایک مسجد کے لئے دس دس ہزار مسلمان جان دے دیتے ہیں، پھر اگر اسلام کی تعلیم میں کوئی ایسا جہاد موجود ہے جیسا کہ یورپ نے سمجھا ہے، تو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کو کبھی بھی اپنے ایک سب سے بڑے فرضِ دینی اور خصوصیتِ ملّی کو پورا کرنے کا خیال نہیں آتا؟

اس بارے میں سب سے زیادہ تعجب انگیز حالت انگلستان کی ہے، دُنیا بھر میں سب سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی آج اس کے زیرِ حکومت ہے، ہندوستان میں سو برس سے وہ اسلام کا مراقبہ کر رہی ہے، لاکھوں انگریز شب و روز ہم میں رہتے ہیں، اور ہزاروں ہیں جن کے گھر کسی مسلمان کے گھر کے اس قدر قریب ہیں کہ دونوں میں ایک دیوار سے زیادہ کوئی شے حائل نہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ ایک مسلمان پانچ وقت نماز پڑھتا ہے، مگر زندگی میں ایک بار بھی کسی انگریز پر جہاد کا حملہ نہیں کرتا، لیکن باوجود اس کے اگر کسی انگریز سے پوچھا جائے کہ وہ میگنم توپ کا گولہ اپنے دِل کے لئے پسند کرتا ہے یا جہاد کے لفظ کی سماعت کان کے لئے؟ تو اُمید نہیں کہ آخر الذکر حالت کو پہلی صورت پر ترجیح دے۔

قرآنِ حکیم نے اپنے نزول کے وقت عیسائیوں کی ایک خصوصیت یہ بتلائی تھی:

"الذین اتیناھم الکتٰب یعرفونه کما یعرفون أبنائھم وان فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون." .....ترجمہ: "جن لوگوں کو کتبِ آسمانی دی گئی ہیں، وہ اسلام کو ٹھیک اسی طرح پہنچاتے ہیں جیسی اپنی اولاد کو، کہ اس میں کسی کا شک نہیں ہوسکتا، اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دیدہ و دانستہ حق کو چھپاتے ہیں اور وہ اصلیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

آج بھی عیسائیوں کا اسلام کی نسبت یہی حال ہے، آج بھی یورپ کے سیاسی حلقوں میں اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق جو اتہامات لگائے جاتے ہیں وہ کسی غلط فہمی پر نہیں، بلکہ کسی دانستہ شیطنت کے دسیسہ مخفی پر مبنی ہیں، اور اگر اس آیتِ کریمہ کو تمام یورپ پر منطبق کیا جائے تو آخری ٹکڑے کا مستحق ٹھیک ٹھیک انگلستان ہے: **وان فریقا منھم لیکتمون الحق وھم یعلمون.**

کروسیڈ کے زمانے میں یورپ اسلام کی نسبت جو کچھ کہتا تھا، اس میں بھی غلط فہمی اور ناواقفیت صرف عام لوگوں کو تھی، ورنہ ایک گروہ تھا جو صرف پولیٹکل اغراض سے دانستہ عیسائیوں کے تعصب کو بھڑکاتا تھا اور اس قسم کے اتہامات کو شہرت دیتا تھا، علی الخصوص مشرقی

یورپ کے پادری، جو اِسلام کی تعلیم اور مسلمانوں کے طرزِ معاشرت سے پوری واقفیت رکھتے تھے، ممکن نہ تھا کہ محض غلط فہمی اور سوءِ فہم کی وجہ سے مسلمانوں کو بت پرستوں کی ایک وحشیانہ قوم سمجھتے ہوں، اسپین کی درسگاہوں سے صدہا عیسائی تعلیم حاصل کر کے نکلتے تھے اور کون تسلیم کرسکتا ہے کہ وہ ان صدہا گرجوں سے واقف نہ تھے جو قرطبہ اور غرناطہ میں پوری رونق اور آزادی کے ساتھ ذمیوں کی عبادت گاہ تھے، ممکن ہے کہ آج بھی انگلستان اور فرانس میں بہت سی کمزور دِل کی لیڈیاں ہوں، جو ''جہاد'' کا لفظ سن کر سہم جاتی ہوں، مگر جب کبھی اسلام کے جہادی اسپرٹ کی نسبت ہنگامہ برپا کرایا جاتا ہے تو اس کے محرک وہی لوگ ہوتے ہیں جو ٹھیک کسی مسلمان کی طرح جانتے ہیں کہ اسلام ایک دِینِ صلح و امن ہے، اور ان حالتوں کے سوا جس میں اس کی ہستی کی بقا کے لئے مدافعت ناگزیر ہو جاتی ہے، کبھی خون و قتل کو جائز نہیں رکھتا، لیکن یہ دانستہ اس طرح کی مکذوبات کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، کیونکہ جب تک اسلام کو مجرم ثابت نہ کریں، اس وقت تک اس کو سولی پر چڑھا نہیں سکتے۔

دُنیا گو نہیں بدلی، مگر دُنیا کی ہر چیز کا غلاف بدل گیا ہے، ایک زمانہ تھا جب انہوں نے یروشلم کے لئے مذہب کے نام پر جہاد کیا تھا، اب اس طریقے سے شرم آتی ہے، پس تہذیب، تمدن اور استیصال دہشت کے نام سے ایک کروسیڈ شروع کر دیا گیا ہے، پھر جب تک اسلام کی دہشت قائم نہ رکھی جائے گی، تمدن کا دیوتا کیونکر اس کی قربانی قبول کرے گا؟

آج سے نہیں بلکہ عرصے سے ہم کو معلوم ہے کہ بعض محتسب حلقوں میں ہماری نسبت کیا خیال کیا جاتا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ من جملہ اور بہت سی باتوں کے ایک لفظِ ''جہاد'' کا اعادہ تکرار بھی ہے، بہت سے لوگ ہیں جو اس لفظ کو سن کر سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھے ہیں اور ''الہلال'' کی سطروں پر اُنگلیاں رکھ کر گننا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لفظ ہر صفحے میں کتنی مرتبہ استعمال کیا گیا ہے؟ بے شک ہم نے آغازِ جنگِ طرابلس کے وقت جو تقریر کی تھی اس میں جنگِ طرابلس کو جہاد سے تعبیر کیا تھا، اور اس کو ایک اسلامی مسئلہ اور یورپ کی اصطلاح کے مطابق ایک دِینی جنگ بتایا تھا، اس میں بھی شک نہیں کہ ''الہلال'' کے صفحوں پر ہم نے ہمیشہ اس

جنگ کو ''جہاد'' قرار دیا اور ''نامورانِ غزوۂ طرابلس'' کی ایک مستقل سرخی رکھی، یہ بھی واقعہ ہے کہ ابھی ابھی ۲۷/اکتوبر کی تقریر میں ہم نے علانیہ مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی اور وہی کہا جو مسلمانوں کو ہمیشہ کہا گیا ہے کہ: ''جاھدوا بأموالکم و أنفسکم فی سبیل اللہ''، یہ بھی سچ ہے کہ ہم جابجا قرآنِ کریم کی ان آیتوں کو، جن میں جہاد کا ذکر ہے، موجودہ حالات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں، اور دراصل یہی ہمارا جرمِ حقیقی ہے کہ قرآن نامی ایک کتاب ہے، جسے ہم ترک نہیں کر سکتے۔ یہ تمام صحیح اور ناقابلِ تاویل واقعات ہیں جن کو قبل اس کے کہ اور لوگ تلاش و جستجو کے بعد مرتب کریں، ہم نے خود ہی یہاں جمع کر دیا ہے، لیکن پھر ہم نہیں سمجھتے کہ ہم سے کیا چاہا جاتا ہے؟ ہم نے اگر جنگِ طرابلس و بلقان کو لفظِ ''جہاد'' سے تعبیر کیا تو درحقیقت یہ ہمارا ایک احسانِ عظیم ہے کہ مسیحی دُنیا کو اسلام کی رحمت سے اب بھی محروم نہیں رکھنا چاہتے، اگر ہم نے یہ کہا کہ مسلمانوں کے لئے طرابلس اور بلقان میں ایک معرکہ جہاد گرم ہے نہ کہ قتال، تو فی الحقیقت یہ کہہ کر ایک بہت بڑے خطرۂ عظیم کو یورپ کے سر سے ٹال دیا ہے، جس میں عجب نہیں کہ وہ کسی وقت گرفتار ہو جاتا، کیونکہ اگر ہم موجودہ لڑائیوں کو جو یورپ کا جدید کروسیڈ اسلام کے مقابلے میں جاری کئے ہوئے ہے، اپنی دِینی جنگ کی جگہ مسیحیت کی ''مدنی جنگ'' سمجھ لیں تو یورپ یاد رکھے کہ پھر ہمارا وجود یقیناً اس کے لئے ایک بے امان خطرہ ہو جائے گا، پھر ہمارے سامنے بھی یورپ کی جنگ مدنی کا نمونہ، اتباع و پیروی کے لئے آجائے گا، پھر ممکن ہے کہ مسلمان بھی مقابل فریق جنگ کے سوا ہر وجود مسیحی کو ویسا ہی مستحق قتل و غارت سمجھ لیں جیسا کہ ۲۶/اکتوبر کو طرابلس کی مدنی جنگ میں ان کی جرنیل نے سمجھا تھا، ممکن ہے کہ ان کی تلوار بھی کسی بوڑھے مرد اور کسی کمزور عورت کو مستثنیٰ نہ کرے جس طرح شہر طرابلس میں اٹلی کے جنگ جویانِ تمدن نے کیا تھا، کچھ بعید نہیں کہ وہ بھی مقتول لاشوں کے اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیں جس طرح جنگِ رُوم و رُوس میں رُوسی کاسکوں نے ترک لاشوں کے ساتھ کیا تھا، اور کیا عجب ہے کہ اختتامِ جنگ کے بعد وہ بھی اپنے کسی دُشمن کی لاش کو قبر سے نکال کر لٹکا دیں جس طرح سوڈان کے فاتح کو کرنا پڑا تھا، یہ سب کچھ ہوسکتا ہے کیونکہ

مسلمانوں کے آگے پھر ایک ''مدنی جنگ'' ہوگی کہ نہ ''دِینی''، لیکن اگر ہم نے موجودہ لڑائیوں کو قتل دِینی سے تعبیر کیا اور اس کو (بزعمِ یورپ) ایک حربِ دِینی قرار دیا تو پھر معاً ہمارے ہاتھ بندھ جائیں گے، ہماری تلوار مقید ہو جائے گی، اس کی خودمختاری اور بے روک آزادی قائم نہیں رہے گی، کیونکہ اس کو حکمِ قرآنی کی سلطنت کے ماتحت ہو جانا پڑے گا جو کہتا ہے کہ:

''وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا، ان اللہ لا یحب المعتدین.'' .....ترجمہ: ''اللہ کی راہ میں صرف ان کو قتل کرو جنھوں نے تمہارے ساتھ مقاتلہ کیا ہے، اور زیادتی مت کرو، اللہ تعالیٰ ظلم و زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔''

پس ہمارے لئے معصیت ہو جائے گا، ہم اپنے خدا کی نظروں میں مبغوض ہو جائیں گے، اگر ان لوگوں کے سوا جو مسلمانوں کے مقابلے میں صف آرا ہیں، کسی دُوسرے غیر مسلم کو اپنا مخالف سمجھیں گے اور کوئی ادنیٰ قسم کا بھی نقصان پہنچائیں گے، کیونکہ پھر ہماری تمام جنگ ''الذین یقاتلونکم'' میں محدود و مقید ہو جائے گی، قرآن نے ہم کو حکم دیا ہے کہ:

''لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا الیھم، ان اللہ یحب المقسطین، انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم وظاھروا علٰی اخراجکم أن تولوھم، ومن یتولھم فأولٰئک ھم الظّٰلمون.'' (۶۰:۳).....ترجمہ: ''جن لوگوں نے تم سے دِین کے لئے جنگ نہیں کی اور تم کو گھروں سے نہیں نکالا، اللہ اس سے نہیں روکتا کہ تم ان کے ساتھ احسان اور بھلائی کرو اور انصاف کے ساتھ پیش آؤ، کیونکہ اللہ عدل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ اللہ تو تم کو صرف انہی لوگوں سے میل ملاپ رکھنے سے روکتا ہے جنھوں نے تم سے مقابلہ کیا، اور تم کو گھروں سے نکالا، یا تمہارے دُشمنوں کی مدد کی، بے شک جو شخص ایسے لوگوں سے دوستی رکھے گا اس کا

شمار مسلمانوں پر ظلم کرنے والوں میں ہوگا۔''

پہلی آیت میں نہی کی نفی کردی گئی تھی کہ غیر محارب جماعتوں سے (اگر چہ وہ محارب جماعتوں کے ہم جنس اور ہم مذہب ہی ہوں) دوست اور حسن معاملہ سے نہیں روکا جاتا، لیکن پھر اس کو بھی اظہار رأفت ورحمت کے لئے کافی نہیں سمجھا، اور دُوسری آیت میں مکرر نہی کا حصر کیا گیا تا کہ مطلب بالکل واضح تر اور حکم بالکل غیر مشتبہ ہو جائے، ''انما'' حصر کے لئے تھا، مگر ''فأولٰئک هم الظّٰلمون'' بھی افادہ معنی حصر کرتا ہے۔

پس اگر ہمارے سامنے ایک ''حربِ دِینی'' ہوگا تو ہمارے لئے محال ہو جائے گا کہ فریق جنگ کے اعمال کا ان کی پوری جنس اور قوم کو ذمہ دار سمجھیں، اس صورت میں ہم ''متمدن'' نہ ہوں گے بلکہ ''مسلمان'' ہوں گے، اور ہمارے تمام اعمال تابع اسلام ہو جائیں گے، ہم دیکھیں گے کہ طرابلس میں ایک مسیحی قوم ہم پر ظلم وستم کر رہی ہے مگر ہم ہندوستان میں تمام عیسائیوں سے دوستی اور حسن معاملہ سے پیش آئیں گے، اور ان کو اپنا دُشمن نہیں سمجھیں گے، کیونکہ یورپ کی مدنیہ نہیں، مگر خدا نے ہم کو ایسا ہی حکم دیا ہے، ہم دیکھیں گے کہ بلقان کی مسیحی سازش اور ان کے یورپین پس پردہ معاون، محض ظلم وعدوان سے ہم پر حملہ آور ہیں مگر ہم ہندوستان میں کسی یورپین حتیٰ کہ کسی بلغاری یا سروین کو بھی تیز نظر سے نہ دیکھ سکیں گے، کیونکہ اس نے اسلام کے مقابلے میں تلوار نہیں اُٹھائی ہے، اور اگر ہم میں سے کوئی اس کے خلاف کرے گا تو وہ حسب تعلیم قرآن خدا کی نظروں میں مبغوض، اس کی محبت سے محروم اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان نہ ہوگا۔

پھر ہم کو ہمارے مخاطبین صاف صاف بتلا دیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے وہ کون سی صورت پسند کرتے ہیں؟ جنگِ مدنی یا جنگِ دِینی؟ قتل حرب یا قتل جہاد؟ اگر ''جہاد'' کا لفظ ان کو خوش نہیں آتا تو اعلان کر دیں تا کہ ہم بھی حربِ دِینی کو چھوڑ کر یورپ کی مدنی جنگ کو سیکھنے کی کوشش کریں۔ (از مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ ہفت روزہ ''الہلال'' مؤرخہ ۱۳ر نومبر ۱۹۱۲ء)

عملی مشکلات کا حل..... مفتی اعظم حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمہ اللہ فرماتے

ہیں: احقر جب ۱۳۲۶ھ میں دارالعلوم دیوبند کے نصابِ تعلیم سے فارغ ہوا تو کاٹھیاوار کے شہر ''ویراول'' کے ایک عربی مدرسہ میں خدمتِ درس کے لئے مجھے بلایا گیا۔ بعض اکابر نے اس کی موافقت فرمائی اس لئے جانے کا ارادہ کرلیا۔ احقر نے اپنے اُستاذ محترم حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ صدر مدرّس دارالعلوم دیوبند سے جانے کی اجازت طلب کی اور عرض کیا: ''وہاں کوئی ایسے بزرگ سر پر نہ ہوں گے جن سے علمی مشکلات میں رُجوع کیا جاسکے۔''

ارشاد فرمایا: ''میں تمہیں ہر فن کی چند کتابوں کے نام بتاتا ہوں، ان کو مطالعے میں رکھو، اِن شاء اللہ سب مشکلات کا حل ثابت ہوں گی۔''

یہ کام اس علوم وفنون کے بحرِ ذخار کا تھا جس کی نظر علوم وفنون کے سب کتب خانوں پر پوری طرح حاوی تھی، اور حافظہ ایسا خزانہ تھا کہ اس میں جو چیز پڑ گئی محفوظ ہوگئی، اس لئے احقر نے مجلس سے اُٹھنے کے بعد جو کتب یاد رہیں ان کو تحریر کرلیا، برادران اہلِ علم کے لئے پیش کرتا ہوں۔ فنِ حدیث میں فتح الباری شرح بخاری، فقہ میں بدائع الصنائع اور ہدایہ، اُصولِ فقہ میں تحریر الاصول (ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ) اور اس کی ملخصات جو بعض علماء نے کی ہیں، علمِ معانی و بدائع میں شرح تلخیص المفتاح بہاء الدین، فنِ نحو میں اشمونی، فنِ منطق میں شرح سلم بحر العلوم۔ (کشکول، ص: ۳۱۷)

فائدہ..... پیارے دوستو! اچھی کتابیں جمع کرتے رہیے، اس سلسلے میں اپنے اساتذہ سے ضرور مشورہ کیا کریں، خاص کر وہ اہم کتب جو علمی مشکلات کے حل میں تمام عمر رہ نما ثابت ہوتی ہیں، ان کی خریداری کو ترجیح دیجئے۔

حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ..... کاندھلہ میں ایک مرتبہ کسی زمین کے ٹکڑے پر مسلمانوں اور ہندوؤں میں تصادم ہوگیا، دونوں فریق اسے اپنی ملکیت بتاتے تھے اور کوئی بھی اپنے دعوے سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا، حالات جب زیادہ کشیدہ ہوگئے اور قتل وقتال کا خطرہ پیدا ہوگیا تو مصالحت کی خاطر ضلعی صدر مقام سہارنپور سے

ایک اعلیٰ انگریز افسر آیا اور اس نے حضرت مولانا مظفر حسین کاندھلوی رحمہ اللہ کو بلا بھیجا، اور کہا کہ وہ جس قوم کے حق میں فیصلہ دیں گے، میں مان لوں گا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ہندوؤں نے بھی آپ کے نام پر اتفاق کرلیا اور کوئی چوں چراں نہ کی۔ مسلمانوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ ہمارا مولوی ہمارے حق ہی میں گواہی دے گا، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ہمارے خلاف گواہی دے کر برسرِ عام مسلمانوں کی ناک کٹوادیں۔

۱۸۵۷ء کے المیے کو گزرے زیادہ مدت نہیں گزری تھی، مسلمانوں کے دِلوں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی تھی، چنانچہ مولانا نے انگریز افسر سے ملنے سے انکار کردیا، جب بار بار اصرار کیا گیا اور عرض کیا گیا کہ حضرت! آپ کی گواہی کی وجہ سے ایک بڑے تصادم کا خطرہ ٹل سکتا ہے تو آپ اس شرط پر عدالت میں آنے کے لئے تیار ہوئے کہ میں اس افسر کا چہرہ نہیں دیکھوں گا۔ ان صاحب نے اس شرط کو مان لیا، آپ تشریف لائے اور انگریز کی طرف پشت کرکے کھڑے ہوگئے اور ہزاروں مسلمانوں اور ہندوؤں کی موجودگی میں اعلان کیا کہ زمین کا متنازعہ ٹکڑا دراصل ہندوؤں کا ہے اور اس پر مسلمانوں کا دعویٰ بالکل بے جا ہے، چنانچہ آپ کی گواہی کی بنیاد پر یہ پلاٹ ہندوؤں کے حوالے کردیا گیا۔ مشہور ادیب جناب احسان دانش مرحوم یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے دِلوں کو جھنجوڑ دینے والا ایک جملہ کہہ گئے ہیں، فرماتے ہیں: ''اس دن مسلمان ہار گئے لیکن اسلام جیت گیا۔'' اور اسلام یوں جیتا کہ مولانا کی سچائی، عدل پسندی اور حق گوئی کو دیکھ کر اس دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہندوؤں کے ۲۴ خاندانوں نے اسلام قبول کرلیا۔

کردار کا واقعہ تو آپ نے ماضی قریب کے ایک بزرگ کا سن لیا، تلوار کا ایک مختصر واقعہ ماضی بعید کا سن لیجئے! پھر آپ کو عنوان کے سمجھنے میں آسانی ہوجائے گی۔

جب مسلمانوں کی فوجیں ایران کے دَر و دیوار پر دستک دینے لگیں تو اس وقت کے سپر پاور کسریٰ نے انہیں مذاکرات کی دعوت دے ڈالی۔ مذاکراتی ٹیم کے طور پر حضرت حذیفہ بن

یمان اور حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہما کا انتخاب ہوا، دونوں گھوڑوں پر سوار اپنے مجاہدانہ اور سادہ لباس میں کسریٰ کے محل تک جا پہنچے، دربان کی نظر جب کترنوں میں لپٹی ہوئی حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کی تلوار پر پڑی تو تو اس نے پھبتی کسی کہ کیا تم اسی تلوار سے ایران جیسی سپر پاور کو فتح کرنے آئے ہو؟ لیکن جب اس نے حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کی تلوار کے جوہر دیکھے تو زرق برق لباس میں ملبوس اور ''جدید'' ہتھیاروں سے مسلح ''سیکورٹی گارڈ'' کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور انہیں یقین آ گیا کہ اصل چیز تلوار اور اسلحہ نہیں ہے بلکہ اسے چلانے والے ہاتھ اصل ہیں، اگر دِلوں میں یقین اور ہاتھوں میں دَم خم ہو تو بظاہر پُرانا اسلحہ بھی کارآمد ثابت ہوتا ہے اور اگر دِل سوزِ یقین سے خالی اور ہاتھ جام وسبو اُٹھانے کے عادی ہو چکے ہوں تو پھر جدید ترین اسلحہ بھی بے کار ثابت ہوتا ہے۔

شوق پورا کرنا..... ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمہ اللہ نے اس کی ایک مثال دی، فرمایا کہ: فرض کریں کہ ایک ویرانے جنگل میں ایک شخص اور صرف اس کی بیوی ہے اور کوئی شخص قریب میں موجود نہیں، اس حالت میں نماز کا وقت ہو گیا اور مسجد آبادی کے اندر فاصلے پر ہے، اب یہ شخص اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ: چونکہ نماز کا وقت ہو گیا ہے اس لئے میں تو مسجد میں جا کر جماعت سے نماز ادا کروں گا۔ اس کی بیوی کہتی ہے کہ: اس ویرانے جنگل کے اندر میں تنہا ہوں، کوئی پاس نہیں، اب اگر تم نماز کے لئے دُور آبادی میں چلے گئے تو اس ویرانے میں خوف کی وجہ سے میری تو جان نکل جائے گی۔ لیکن شوہر کہتا ہے کہ: جماعت سے صفِ اوّل میں نماز پڑھنے کی بڑی فضیلت ہے، میں تو صفِ اوّل میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کروں گا، اس فضیلت کو میں حاصل کروں گا، چاہے کچھ ہو جائے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ: یہ دِین نہ ہوا، یہ تو صفِ اوّل میں نماز پڑھنے کا شوق ہو گیا، اس شوق کو پورا کر رہا ہے، اس لئے کہ اس وقت دِین کا تقاضا تو یہ ہے کہ جماعت کی نماز کو چھوڑو اور وہیں پر تنہا نماز پڑھو، اگر ایسا نہیں کرو گے تو پھر اپنا شوق پورا کرنا ہو جائے گا، اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہ ہو گی۔

یا مثلاً گھر میں والدین بیمار ہیں، بیوی بچے بیمار ہیں، اور ان کو آپ کی خدمت کی ضرورت ہے، لیکن آپ کو تبلیغ میں جانے کا شوق ہوگیا، اور آپ نے کہا کہ: میں تبلیغ میں جاتا ہوں۔ دیکھئے! ویسے تبلیغ میں جانا بڑا ثواب کا کام ہے، لیکن اس حالت میں جبکہ والدین یا بیوی بچوں کو تمہاری خدمت کی ضرورت ہے اور تمہاری خدمت کے بغیر ان کا کام نہیں چلے گا، تو اس حالت میں یہ اپنا شوق پورا کرنا ہوگا، یہ دِین کا تقاضا نہ ہوگا، اور دِین اپنا شوق پورا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننے کا نام دِین ہے، جس وقت جس کام کا تقاضا ہے اس وقت اس کو انجام دو۔

آپ نے اس حدیث میں دیکھا کہ ایک صحابی آئے اور عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! میں جہاد میں جانا چاہتا ہوں، لیکن آپ نے ان کو منع فرمایا اور فرمایا کہ تمہارے لئے حکم یہ ہے کہ جاکر والدین کی خدمت کرو۔

حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہیں اور مسلمان ہیں، اور وہ چاہتے بھی ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کی زیارت کروں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت وسعادت ایسی خوش نصیبی ہے کہ شاید اس رُوئے زمین پر اس سے بڑی سعادت اور خوش نصیبی کوئی اور نہیں ہوگی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دُنیا سے تشریف لے جائیں تو پھر آپ کے جانے کے بعد یہ شرف حاصل نہیں ہوسکتا، لیکن حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی واسطے سے پوچھا کہ: یا رسول اللہ! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں، لیکن میری والدہ بیمار ہیں اور ان کو میری خدمت کی ضرورت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حاضر ہونے سے منع فرمادیا اور یہ فرمادیا کہ: تم یہاں میری زیارت اور ملاقات کے لئے مت آؤ، بلکہ والدہ کی خدمت کرو۔ (بحوالہ اصلاحی خطبات، ج:۴، حضرت مولانا محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم)

جانوروں پر رحم..... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی سفر میں تھے، ایک جگہ ہم نے ایک ''حمرہ'' (چڑیا جیسا ایک چھوٹا سا

پرندہ) دیکھا، جس کے ساتھ اس کے دو بچے بھی تھے، ہم نے ان دونوں کو پکڑ لیا، حمرہ آ کر ہمارے سروں پر منڈلانے لگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تک آئے، آپ نے فرمایا: اس کے بچے چھین کر اس کو کس نے دُکھ پہنچایا ہے؟ اس کے بچے اس کو واپس کر دو۔ اور اسی سفر کا یہ واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ چیونٹیوں کا گھر جلا دیا گیا ہے، تو آپ نے فرمایا: ''یہ کس نے جلایا ہے؟'' ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: ہم نے جواب دیا: ہم نے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے سوا کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کو آگ میں جلانے کی سزا دے۔'' (ابوداؤد بحوالہ اسلامی تہذیب کے درخشاں پہلو، ص: ۱۷۳)

فقہائے اسلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی انہی ہدایات کی روشنی میں اُصول وضع کیا ہے کہ مالک پر لازم ہے کہ وہ حیوانات کی ضروریات فراہم کرے، اگر وہ اس کی ضروریات فراہم نہیں کر سکتا تو اسے اسلامی حکومت مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اسے جنگلات میں کھلا چھوڑ دے یا فروخت کر دے۔ اسلامی تعلیم کا یہ پہلو منفرد حیثیت رکھتا ہے کہ اگر ایک اندھی بلی کسی کے گھر چلی جائے اور اِدھر اُدھر نہ جا سکے تو اس کے گھر والوں پر اس کی خوراک واجب ہو جاتی ہے، اسی طرح فقہاء نے قوّت سے زیادہ جانوروں پر بوجھ لادنے سے منع کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں جا رہے تھے کہ انصار کی کسی عورت نے اُونٹنی سے کہا: ''تم پر لعنت'' جبکہ وہ اس پر سواری کر رہی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں میں جب یہ آواز پڑی تو آپ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا: اس اُونٹنی سے نیچے اُتر آؤ اور اسے کھلا چھوڑ دو، کیونکہ جس سواری پر لعنت کر دی جائے، اس سے کام لینا جائز نہیں۔

اسلام کی انہی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے ایک خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

''گھوڑوں کو بے جا کچوکے نہ لگائے جائیں، کسی شخص کو گھوڑے کے منہ میں بھاری لگام ڈالنے کی اجازت نہ دیں، نہ ایسا کوڑا استعمال کرنے کی اجازت دیں جس کے سرے پر لوہا لگا ہوا ہو۔''

حیوانوں کے ساتھ رحمانہ برتاؤ کی ایک دِلکش مثال وہ ہے جو ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابوداؤد رضی اللہ عنہ نے پیش کی، انہوں نے وفات کے وقت اپنے اُونٹ سے مخاطب ہوکر کہا: ''اے اُونٹ! قیامت کے دن اپنے رَبّ کے سامنے مجھ سے نہ جھگڑنا، کیونکہ میں نے تیری طاقت سے زیادہ کبھی تجھ پر بوجھ نہیں ڈالا۔'' ایک دُوسرے صحابی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ چیونٹیوں کے لئے روٹی کا چورا بناتے اور کہتے تھے: ''یہ ہماری پڑوسن ہیں، لہٰذا ہم پر ان کا بھی حق ہے۔''

اسلام نے اپنی مقدس تعلیمات میں انسانوں کے ہر طبقے کے علاوہ حیوانوں تک سے حسنِ سلوک اور نیکی کا حکم دیا ہے، لیکن چشمِ فلک نے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں یہ بھی دیکھا ہے کہ وہاں جانور تو جانور، انسان بھی کسی رحم وکرم کے مستحق قرار نہیں پاتے۔ (طلوعِ سحر، حضرت مولانا ضیاء الرحمٰن فاروقی شہید)

زبان کی حفاظت.....

حق تعالیٰ نے فرمایا ہے:

''وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے۔''

یہ فرشتے کراماً کاتبین ہیں، یہ انسان کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات فوراً چک لیتے ہیں اور انسان کے تمام اعمال واقوال ریکارڈ کر لیتے ہیں۔

گھر میں لڑائی ہو رہی تھی، عورتیں لڑتی بہت ہیں، اور جب لڑتی ہیں تو ان کو خیال نہیں رہتا کہ ہمارے منہ سے کیا نکل رہا ہے؟ بہر حال عورتیں لڑ رہی تو ایک لڑکے نے یہ شرارت کی کہ اس نے خفیہ ٹیپ لگا دی، اب عورتوں کی لڑائی میں جو الفاظ زبان سے نکلتے ہوں گے، ذرا غور کیجئے کہ اگر ٹیپ ان کو سنائی جائے تو ان کو خود کتنی شرم آنے لگے گی؟ جس طرح ٹیپ ریکارڈر اپنے اندر تمام الفاظ کو بند کر لیتا ہے اور محفوظ کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم زبان سے جو بھی لفظ نکالتے ہو، تمہارے پاس ایک فرشتہ موجود ہوتا ہے، جو اس کام کے لئے

مقرّر رہوتا ہے، جوان الفاظ کو اچک لیتا ہے، بند کر لیتا ہے، یہ کراماً کاتبین ہیں۔

ان کے پاس ٹیپ ریکارڈر ہے اور یوں کہتے ہیں کہ آدمی کی حرکات وسکنات کے ساتھ ان کے قلب کو حرکت ہوتی ہے، یعنی جوں جوں آدمی حرکت کرتا ہے یا اس کی زبان حرکت کرتی ہے یا اس کے ہاتھ پاؤں حرکت کرتے ہیں، جس طرح بھی آدمی حرکت کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ کراماً کاتبین کا قلم چلنے لگتا ہے، ان کو لکھنے میں تکلیف نہیں ہوتی، دُوسرے الفاظ میں یوں کہہ دو کہ ان کے پاس لکھنے کی خودکار مشینیں ہوتی ہیں، ہماری ہر حرکت کو قلم بند کرنے کے لئے اور ہمارے تمام الفاظ کو ضبط کرنے کے لئے ان (کراماً کاتبین کے) کے پاس خودکار مشینیں ہیں۔

یہ بات یہاں کی نہیں، دُوسری جگہ کی ہے، لیکن یہاں ذکر کر دیتا ہوں۔ جب آدمی مرتا ہے تو کراماً کاتبین کو چھٹی مل جاتی ہے، اگر نیک آدمی ہو تو فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تم کو جزائے خیر عطا فرمائیں، ہمیں تمہاری بہت اچھی رفاقت حاصل رہی، اور اگر بُرا آدمی ہو تو مرتے وقت کراماً کاتبین اس کو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو تجھ پر، تو نے کہاں کہاں ہمیں پھرایا، اور کتنی کتنی گندی جگہوں پر ہمیں لے گیا، تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ مراقبہ بتایا ہے کہ اگر ہم اس کو ذہن میں رکھیں، اپنے سامنے رکھیں، تو ہمیں اس ہتھیار کو بند رکھنے میں یا صحیح طور پر استعمال کرنے میں مدد مل سکتی ہے، حدیث شریف میں فرمایا ہے:

"المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده." .....ترجمہ: "مسلمان تو وہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان سے اور اس کے ہاتھ سے محفوظ رہیں۔"

یعنی مسلمان وہ ہے کہ دُوسرے مسلمانوں کو اس کے وجود سے ایذا نہ پہنچے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے وجود کو ذکر کرنے کے بجائے اس کے دو اعضاء کا نام لیا، ایک زبان، دُوسرے ہاتھ، یعنی اس کی زبان سے اور اس کے ہاتھوں سے لوگوں کو ایذا نہ پہنچے۔ علماء فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اکثر ایذا انہی دو چیزوں سے پہنچتی ہے، اور جب تک کہ ان دو چیزوں کی حرکت نہ ہو آدمی اپنے باقی وجود سے کسی کو ایذاء نہیں

پہنچا سکتا، ان دونوں اعضاء کے بغیر کسی کو ایذا پہنچانا ممکن ہی نہیں ہے۔ (خطباتِ لدھیانوی، از مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ)

اختلافِ رائے کی حدود..... اختلافِ رائے کچھ مذموم نہیں، اگر اپنی حدود کے اندر ہو، انسان کی فطرت میں اس کے پیدا کرنے والے نے عین حکمت کے مطابق ایک مادّہ غصّے اور مدافعت کا بھی رکھا ہے، اور وہ انسان کی بقا و ارتقا کے لئے ضروری ہے، مگر یہ مادّہ دُشمن کی مدافعت کے لئے رکھا ہے، اگر اس کا رُخ دُوسری طرف ہو جائے، خواہ اس لئے کہ دُشمن کو پہچاننے اور متعین کرنے میں غلطی ہوگئی ہو یا کسی دُوسری وجہ سے، بہر حال جب دُشمن کا رُخ بدلے گا تو یہ خود اپنی تباہی کا ذریعہ بنے گا، اسی لئے قرآنِ کریم نے مؤمن کے لئے پوری وضاحت کے ساتھ اس کا رُخ متعین فرما دیا ہے: ''**انّ الشیطٰن لکم عدوٌّ فاتخذوہ عدًّا**'' شیطان تمہارا دُشمن ہے، اس کو ہمیشہ دُشمن سمجھتے رہو۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ مؤمن کے غصّے اور لڑائی کا مصرفِ صحیح صرف شیطان اور شیطانی طاقتیں ہیں، جب اس کی جنگ کا رُخ اس طرف ہوتا ہے تو وہ جنگ قرآن کی اصطلاح میں ''جہاد'' کہلاتی ہے جو اعظم عبادات میں سے ہے، حدیث میں فرمایا ہے: ''**ذروۃ سنامہ الجھاد**'' یعنی اسلام میں سب سے اعلیٰ کام جہاد ہے، لیکن اگر اس جنگ کا رُخ ذرا اس طرف سے ہٹا تو یہ جہاد کے بجائے فساد کہلاتی ہے، جس سے بچانے ہی کے لئے اللہ کے سارے رسول اور کتابیں آئی ہیں، شکل و صورت کے اعتبار سے جہاد اور فساد میں کوئی فرق نہیں ہوتا، وہ کانٹا جہاں سے یہ لائنیں بدلتی ہیں صرف یہ ہے کہ اس کا رُخ شیطان اور شیطانی طاقتوں کی طرف ہے تو جہاد ہے، ورنہ فساد۔ دو قومی نظریہ جس نے پاکستان بنوایا، اسی اجمال کی عملی تفصیل تھی کہ کلمۂ اِسلام کے ماننے والے ایک متحد قوم ہیں، اور نہ ماننے والے دُوسری قوم، ان کے جہاد کا رُخ اس طرف ہونا چاہئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے جہاد کے فرض ہونے کی ایک حکمت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ قہر و غضب اور مدافعت کا مادّہ جو انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے جب جہاد کے ذریعے اپنا صحیح مصرف پالیتا ہے تو آپس کی خانہ جنگی اور فساد سے خود بخود نجات ہو جاتی ہے، ورنہ اس کی

مثال ایسی ہوتی ہے کہ جس چھت میں بارش کا پانی نکلنے کا راستہ پَرنالوں کے ذریعے نہ بنایا جائے تو پھر یہ پانی چھت کو توڑ کر اندر آتا ہے۔

اصلاحِ حال کی ایک غلط کوشش..... ہمارے نوتعلیم یافتہ روشن خیال مصلحین کی توجہ جب اس باہمی اختلاف کے مہلک نتائج کی طرف جاتی ہے اور اس کے علاج کی فکر ہوتی ہے تو ان کے خیال میں ساری خرابیاں صرف ان اختلافات میں نظر آتی ہیں جو دِین و مذہب کے نام پر سامنے آتے ہیں، اور وہ صرف اسی اختلاف کو مٹانے کے لئے علاج سوچتے ہیں، وہ اس وقت ان سب لڑائیوں کو بھول جاتے ہیں، جو خالص نفسانی اور ذاتی غرض کے لئے لڑی جارہی ہیں، جن کے لئے ایک دُوسرے کی جان، آبرو اور مال سب کچھ حلال سمجھ لیا جاتا ہے، جس کے پیچھے پورے ملک میں باہمی منافرت کے سیلاب اُمنڈتے ہیں، مگر ان کو چونکہ نئی تہذیب و شرافت کا نام دے دیا ہے اس لئے نہ وہ قوم کے لئے کوئی مرض رہا، نہ اس کا علاج سوچنے کی ضرورت رہی۔ اختلاف ولڑائی میں صرف مُلّا بدنام ہے، اسی کا علاج زیرِ غور ہے، حالانکہ دِین و مذہب کے نام پر جو اختلافات ہیں، اگر غور کیا جائے تو ان کی خرابی صرف حدود سے تجاوز کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، ورنہ وہ کوئی برادری کا نوتہ نہیں بن سکتے، وہ اپنے فانی حقوق نہیں جنھیں ایثار کیا جاسکے، بلکہ قرآن وسنت کی تعبیر کے اختلافات ہیں، جن کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے بعض روشن خیال مصلحین نے سارا فساد انہیں اختلافات میں منحصر سمجھ کر اس کا یہ علاج تجویز کیا کہ فرقہ وارانہ اختلافات کو ہٹا کر سب کا ایک نیا اور مشترک مذہب بنالیا جائے، پوری قوم کا وہی ایک مذہب ہو، تاکہ اختلاف کی بنیاد ہی ختم ہوجائے۔

مگر یہ بات مذہبی مسائل میں عقلاً صحیح ہے نہ عملاً ممکن، ہاں! خالص دُنیوی معاملات جن میں جھگڑا ذاتی حقوق ہی کا ہو، وہاں اپنے اپنے مطالبات کو نظر انداز کر کے ایسی صلح کی جاسکتی ہے، اس لئے باہمی جنگ وجدل کا علاج یہ نہیں کہ اختلافِ رائے کو مٹا کر سب کو ایک نظریئے کا پابند کردیا جائے۔

اختلافِ رائے اور جھگڑے فساد میں فرق..... اہلِ عقل وبصیرت پر مخفی نہیں کہ دِینی

اور دُنیوی دونوں قسم کے معاملات میں بہت سے مسائل ایسے آتے ہیں جن میں رائیں مختلف ہوسکتی ہیں، ان میں اختلاف کرنا عقل و دیانت کا عین مقتضا ہوتا ہے، ان میں اتفاق صرف دو صورتوں میں ہوسکتا ہے، یا تو مجمع میں کوئی اہلِ بصیرت اور اہلِ رائے نہ ہو، ایک نے کچھ کہہ دیا، سب نے مان لیا، اور یا پھر جان بوجھ کر کسی کی رعایت ومروّت سے اپنے ضمیر اور اپنی رائے کے خلاف دُوسرے کی بات پر صاد کر دیا، ورنہ اگر عقل و دیانت دونوں موجود ہوں تو رائے کا اختلاف ضروری ہے، اور یہ اختلاف کبھی کسی حال پر مضر بھی نہیں ہوتا بلکہ دُوسروں کے لئے بصیرت کا سامان مہیا کرتا ہے، اسمبلیوں میں حزبِ اختلاف کو اسی بنیاد پر ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قرآن وسنت کے مجملات اور مبہمات کی تشریح وتعبیر میں اسی طرح کے اختلافات کو ''رحمت'' کہا گیا ہے، جو اسلام کے عہدِ اوّل سے صحابہؓ وتابعینؒ اور پھر ائمہ مجتہدینؒ میں چلے آئے ہیں، ان مسائل میں جو اختلافات صحابہ کرامؓ میں پیش آچکے ہیں، ان کو مٹانے کے معنی اس کے سوا نہیں ہوسکتے کہ صحابہ کرامؓ کی کسی ایک جماعت کو باطل پر قرار دیا جائے، جو نصوصِ حدیث اور ارشاداتِ قرآنی کے بالکل خلاف ہے، اسی لئے حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے فرمایا ہے کہ جس مسئلے میں اختلاف صحابہ کرامؓ کے درمیان ہو چکا ہے اس کو بالکل ختم کر دینا ممکن نہیں۔

آدابِ دُعاء.....لفظ ''دُعاء'' عربی زبان میں کسی کو حاجت روائی کے لئے پکارنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور مطلق یاد کرنے کے معنی میں بھی ہے، اور یہاں دونوں معنی مراد ہوسکتے ہیں، آیت میں ارشاد ہے: ''اُدْعُوْا رَبَّكُمْ'' یعنی پکارو اپنے رَبّ کو اپنی حاجات کے لئے، یا یاد کرو اور عبادت کرو اپنے رَبّ کی۔

پہلی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ اپنی حاجات صرف اللہ تعالیٰ سے مانگو اور دُوسری صورت میں یہ کہ ذکر وعبادت صرف اسی کی کرو، یہ دونوں تفسیریں سلف صالحین، ائمہ تفسیر سے منقول بھی ہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا: ''تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً'' تضرّع کے معنی عجز وانکسار اور اظہارِ تذلل

کے ہیں، اور خفیہ کے معنی پوشیدہ، چھپا ہوا، جیسا کہ اُردو زبان میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں بولا جاتا ہے۔

ان دونوں لفظوں میں دُعا و ذکر کے لئے دو اہم آداب کا بیان ہے، اوّل یہ کہ قبولیتِ دُعا کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے عجز و انکسار اور تذلل کا اظہار کر کے دُعا کرے، اس کے الفاظ بھی عجز و انکسار کے مناسب ہوں، لب و لہجہ بھی تواضع و انکسار کا ہو، ہیئت دُعا مانگنے کی بھی ایسی ہی ہو، اس سے معلوم ہوا کہ آج کل عوام جس انداز سے دُعا مانگتے ہیں، اوّل تو اس کو دُعا مانگنا ہی نہیں کہا جا سکتا، بلکہ پڑھنا کہنا چاہئے، کیونکہ اکثر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ ہم جو کلمات زبان سے بول رہے ہیں ان کا مطلب کیا ہے؟ جیسا کہ آج کل عام مساجد میں اِماموں کا معمول ہو گیا ہے کہ کچھ عربی زبان کے کلماتِ دُعائیہ انہیں یاد ہوتے ہیں، ختمِ نماز پر انہیں پڑھ دیتے ہیں، اکثر تو خود ان اِماموں کو بھی ان کلمات کا مطلب و مفہوم معلوم نہیں ہوتا، اور اگر ان کو معلوم ہو تو کم از کم جاہل مقتدی تو اس سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں، وہ بے سمجھے بوجھے اِمام کے پڑھے ہوئے کلمات کے پیچھے ''آمین، آمین'' کہتے ہیں، اس سارے تماشے کا حاصل چند کلمات کا پڑھنا ہوتا ہے، دُعا مانگنے کی جو حقیقت ہے یہاں پائی ہی نہیں جاتی۔ یہ دُوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے ان بے جان کلمات ہی کو قبول فرما کر قبولیتِ دُعا کے آثار پیدا فرما دیں، مگر اپنی طرف سے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ دُعا پڑھی نہیں جاتی بلکہ مانگی جاتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ مانگنے کے ڈھنگ سے مانگا جائے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنے کلمات کے معنی بھی معلوم ہوں اور سمجھ کر ہی کہہ رہا ہو تو اگر اس کے ساتھ عنوان اور لب و لہجہ اور ہیئتِ ظاہری تواضع و انکساری کی نہ ہو تو یہ دُعا نرا ایک مطالبہ رہ جاتا ہے، جس کا کسی بندے کو کوئی حق نہیں۔

غرض پہلے لفظ میں رُوحِ دُعا بتلا دی گئی کہ وہ عاجزی و انکساری اور اپنی ذِلت و پستی کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت مانگنا ہے، دُوسرے لفظ میں ایک دُوسری ہدایت یہ دی گئی کہ دُعا کا خفیہ اور آہستہ مانگنا افضل اور قرینِ قبول ہے، کیونکہ بآوازِ بلند دُعا مانگنے میں اوّل

تو تواضع وانکسار باقی رہنا مشکل ہے، ثانیاً اس میں رِیا وشہرت کا بھی خطرہ ہے، ثالثاً اس کی صورتِ عمل ایسی ہے کہ گویا یہ شخص یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ سمیع علیم ہیں، ہمارے ظاہر و باطن کو یکساں جانتے ہیں، ہر بات خفیہ ہو یا جہر اس کو سنتے ہیں، اسی لئے غزوۂ خیبر کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آواز دُعا میں بلند ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم کسی بہرے کو یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو، جو اتنی بلند آواز سے کہتے ہو، بلکہ ایک سمیع وقریب تمہارا مخاطب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ (اس لئے آواز بلند کرنا فضول ہے)۔ خود اللہ جل شانہ نے ایک مردِ صالح کی دُعا کا ذکر ان الفاظ سے فرمایا ہے: ''اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا'' یعنی ''جب انہوں نے رَبّ کو پکارا آہستہ آواز سے'' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو دُعا کی یہ کیفیت پسند ہے کہ پست اور آہستہ آواز سے دُعا مانگی جائے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علانیہ اور جہراً دُعا کرنے میں اور آہستہ پست آواز سے کرنے میں ستر درجے فضیلت کا فرق ہے۔ سلف صالحین کی عادت یہ تھی کہ ذکر ودُعا میں بڑا مجاہدہ کرتے اور اکثر اوقات مشغول رہتے تھے، مگر کوئی ان کی آواز نہ سنتا تھا، بلکہ ان کی دُعائیں صرف ان کے اور ان کے رَبّ کے درمیان رہتی تھیں، ان میں بہت سے حضرات پورا قرآن حفظ کرتے اور تلاوت کرتے رہتے تھے، مگر کسی دُوسرے کو خبر نہ ہوتی تھی، اور بہت سے حضرات بڑا علمِ دِین حاصل کرتے مگر لوگوں پر جتلاتے نہ پھرتے تھے، بہت سے حضرات راتوں کو اپنے گھروں میں طویل طویل نمازیں ادا کرتے مگر آنے والوں کو کچھ خبر نہ ہوتی تھی، اور فرمایا کہ ہم نے ایسے حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ تمام عبادات جن کو وہ پوشیدہ کر کے ادا کر سکتے تھے کبھی نہیں دیکھا گیا کہ اس کو ظاہر کر کے ادا کرتے ہوں، ان کی آوازیں دُعاؤں میں نہایت پست ہوتی تھیں۔ (ابن کثیر، مظہری)

ابن جریج نے فرمایا کہ: دُعا میں آواز بلند کرنا اور شور کرنا مکروہ ہے، اِمام ابوبکر جصاص حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے اَحکام القرآن میں فرمایا کہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ دُعا کا آہستہ مانگنا بہ نسبت اظہار کے افضل ہے، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ

سے ایسا ہی منقول ہے۔ اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ختم پر جو آمین کہی جاتی ہے اس کو بھی آہستہ کہنا افضل ہے، کیونکہ آمین بھی ایک دُعا ہے۔

ہمارے زمانے کے ائمہ مساجد کو اللہ تعالیٰ ہدایت فرماویں کہ قرآن وسنت کی اس تلقین اور بزرگانِ سلف کی ہدایات کو یکسر چھوڑ بیٹھے، ہر نماز کے بعد دُعا کی ایک مصنوعی سی کارروائی ہوتی ہے، بلند آواز سے کچھ کلمات پڑھے جاتے ہیں، جو آداب ودُعا کے خلاف ہونے کے علاوہ ان نمازیوں کی نماز میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں جو مسبوق ہونے کی وجہ سے اِمام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی باقی ماندہ نماز پوری کر رہے ہیں، غلبۂ رُسوم نے اس کی بُرائی اور مفاسد کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے، کسی خاص موقع پر خاص دُعا پوری جماعت سے کرانا مقصود ہو، ایسے موقع پر ایک آدمی کسی قدر آواز سے دُعا کے الفاظ کہے اور دُوسرے آمین کہیں، اس کا مضائقہ نہیں، شرط یہ ہے کہ دُوسروں کی نماز وعبادت میں خلل کا موجب نہ بنیں، اور ایسا کرنے کی عادت نہ ڈالیں کہ عوام یہ سمجھنے لگیں کہ دُعا کرنے کا طریقہ یہی ہے، جیسا کہ آج کل عام طور سے ہو رہا ہے۔

بادشاہِ شام کے مقابلے میں جرأت و استقامت کی ایک مثال..... الملک الاشرف کے جانشین صالح اسماعیل (ابوالخبش) نے الملک الصالح نجم الدین ایوب بادشاہِ مصر کے مقابلے میں (جس کے شام پر حملے کا خطرہ تھا) فرنگیوں سے مدد چاہی، اور حق الخدمت کے طور پر شہر صیدا اور ثقیف اور چند قلعوں کا پروانہ لکھ دیا، اس دوستانہ تعلق کی بناء پر فرنگی اتنے بے تکلف ہو گئے کہ دمشق میں آکر ہتھیار خریدتے، شیخ عزالدین عبدالسلام (متوفی ۶۶۰ھ) کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آکر ان سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر چلائیں، تاجرانِ اسلحہ نے شیخ سے فتویٰ پوچھا، شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے، اس لئے کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے، شیخ کی طبیعت پر بادشاہ کی اس بے حمیتی اور اسلام کی اس ذِلت و بے بسی کا بڑا اثر تھا، انہوں نے بادشاہ کے لئے خطبے میں دُعا ترک کر دی، اس

کے بجائے وہ منبر پر دونوں خطبوں سے فارغ ہوکر بڑے جوش کے ساتھ دُعا کرتے تھے کہ:
اِلٰہی! اسلام اور حامیانِ اسلام کی مدد اور نصرت فرما، اور ملحدین و دُشمنانِ دِین کو ذِلت ونکبت نصیب فرما۔ تمام مسلمان بڑی رِقت واثر کے ساتھ آمین کہتے تھے، حکومتی آدمیوں نے بڑھا چڑھا کر سلطان کو اس واقعے کی اطلاع دی، شیخ کی گرفتاری کا فرمان صادر ہوا، شیخ ایک عرصے تک محبوس رہے، کچھ عرصے کے بعد وہ دمشق سے بیت المقدس منتقل کئے گئے۔

اسی اثناء میں سلطان صالح اسماعیل الملک المنصور والی حمص، اور سلاطینِ فرنگ اپنی افواج وعساکر کے ساتھ مصر کے ارادے سے بیت المقدس آئے، صالح اسماعیل کے دِل میں شیخ عزالدین کی ناراضگی برابر کھٹکتی رہتی تھی، اور اس کو اس کی فکر تھی، اس نے اپنے عمائد وخواص میں سے ایک شخص کو اپنا رُومال دیا، اور کہا کہ: یہ رُومال شیخ کی خدمت میں پیش کرنا اور انتہائی خوشامد واستمالت کے ساتھ ان سے کہنا کہ سابقہ خدمات ومناصب پر آپ پورے اعزاز کے ساتھ واپس آسکتے ہیں، اگر وہ منظور فرمالیں تو میرے پاس لے آنا، اگر منظور نہ کریں تو میرے خیمے کے پہلو میں دُوسرے خیمے میں ان کو محبوس کر دینا۔ امیر نے شیخ سے بڑی خوشامدانہ باتیں کیں اور ان کی تعظیم وتکریم اور ان کی دِلجوئی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، اور آخر میں کہا کہ آپ را کے ذرا بادشاہ سے نیاز مندانہ مل لیں، اور اس کی دست بوسی کرلیں، تو یہ قصہ رفع دفع وجائے گا، اور آپ اضافہ وترقی کے ساتھ اپنے سابقہ عہدوں پر واپس آجائیں گے، شیخ نے ں کا جو جواب دیا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا، انہوں نے فرمایا:

"واللہ! یا مسکین ما ارضاہ ان یقبل یدی فضلًا عن أقبل یدہ، یا قوم! أنتم فی واد وأنا فی واد، والحمدللہ الذی عافانی ممَّا ابتلاکم بہ." (طبقات الشافعیہ، ج:۵، ص:۱۰۱)

"ارے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے، چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی کروں؟ لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو، میں کسی اور عالم میں، خدا کا شکر ہے کہ میں اس سے آزاد ہوں جس میں تم گرفتار ہو۔"

یہ جواب سن کر اَمیر نے کہا کہ پھر مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو گرفتار کرلوں، شیخ نے کہا: شوق سے! جو کچھ تم سے ہو سکے، اس سے دریغ نہ کرو۔ اَمیر نے ان کو بادشاہ کے خیمے کے پہلو میں دُوسرے خیمے میں رکھا، شیخ اپنے خیمے میں قرآن مجید پڑھتے رہتے تھے، اور بادشاہ اپنے خیمے کے اندر سنتا تھا، ایک روز بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا کہ: تم شیخ کو قرآن مجید پڑھتا ہوا سنتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ: ہاں! کہا: جانتے ہو یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے (ھٰذا أکبر المسلمین)، میں نے اس کو اس لئے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کے قلعے سپرد کر دینے کے خلاف تھا، اور اس پر معترض تھا، میں نے اس کو دمشق کی خطابت اور دُوسرے منصبوں سے معزول کیا اور اس کو دمشق سے شہر بدر کر دیا، اب میں نے تمہاری خاطر پھر اس کو قید کر دیا ہے۔ عیسائی بادشاہوں نے کہا کہ: اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھو کے پیتے۔

اُمراءِ سلطنت کا نیلام..... شیخ کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اہم واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ان اُمراءِ سلطنت کو نیلام کیا جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے، اور شرعی طریقے پر آزاد نہیں کئے گئے تھے، یہ اُمراءِ سلطنت نسلاً ترک تھے، اور سلطنتِ مصر پر بڑے حاوی تھے، ان میں سے ایک نائب السلطنت تھا، شیخ نے فتویٰ دیا کہ جب تک یہ اُمراءِ شرعی طریقے پر آزاد نہ ہوں، ان کے معاملات شرعاً صحیح نہیں ہیں، اور وہ عام غلاموں کے حکم میں ہیں، ان کے فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں احتیاط شروع کر دی، اور وہ بڑی دِقت میں پڑ گئے، یہ دیکھ کر ان اُمراء کے حلقے میں بڑی برہمی اور تشویش پیدا ہوئی، انہوں نے ایک دن جمع ہو کر شیخ کو طلب کیا، اور کہا کہ: آپ کیا چاہتے ہیں؟ شیخ نے فرمایا کہ: ہم ایک مجلس طلب کریں گے اور بیت المال کی طرف سے آپ کا نیلام کریں گے، اور شرعی طریقے پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا۔ انہوں نے سلطان سے عرض کیا کہ: شیخ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں، اور سرِ بازار نیلام کرنے کو کہتے ہیں۔ بادشاہ نے شیخ کو راضی کرنا چاہا، مگر انہوں نے اپنی رائے سے رُجوع نہیں کیا، اس گفت وشنید میں بادشاہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا جو شیخ کی شان کے خلاف تھا، بادشاہ نے اس کا بھی اظہار کیا

کہ شیخ کو اس معاملے سے کیا تعلق؟ اور وہ اُمراء کے قضیہ میں کیوں پڑتے ہیں؟ شیخ یہ سن کر ناراض ہوئے اور انہوں نے مصر سے چلے جانے کا عزم کرلیا، اپنا سامان جانور پر بار کیا، اور گھر والوں کو سوار کیا اور روانہ ہوگئے، ان کی روانگی کی خبر سن کر قاہرہ میں کھلبلی مچ گئی، شہر کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ ان کے پیچھے ہولیا، علماء، صلحاء، تجار، سب ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوگئے، سلطان کو اطلاع ہوئی اور کسی نے اس سے کہا کہ: شیخ عزالدین چلے گئے تو تمہاری سلطنت جاتی رہے گی۔ سلطان خود سوار ہوکر ان کے پاس پہنچا، اور ان کو منا کر شہر واپس لایا اور طے ہوا کہ اُمراء سلطنت کا وہ خود نیلام کریں، یہ سن کر نائب السلطنت نے بڑے خوشامدانہ لہجے میں ان کو اس ارادے سے باز رکھنا چاہا، لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے، نائب کو غصہ آگیا، اس نے کہا کہ: یہ شیخ کیسے ہمارا نیلام کرے گا، ہم ملک کے حاکم ہیں؟ خدا کی قسم! میں اس تلوار سے اس کی گردن اُڑادوں گا۔ چنانچہ وہ اپنے عملے کے ساتھ سوار ہوکر شیخ کے دروازے پر پہنچا، ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی، دروازہ کھٹکھٹایا، شیخ کے صاحبزادہ باہر نکلے تو یہ حال دیکھا کہ نائب السلطنت شمشیر برہنہ لئے دروازے پر کھڑا ہے، انہوں نے اندر جاکر شیخ سے یہ حال کہا، شیخ نے بے پروائی سے جواب دیا کہ: ''بیٹا! تمہارے والد کا یہ رُتبہ کہاں کہ اللہ کے راستے میں شہید ہو'' یہ کہہ کر وہ باہر نکلے، ان کا نکلنا تھا کہ تلوار نائب السلطنت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کے جسم پر رعشہ طاری ہوگیا، اس نے رو کر شیخ سے دُعا کی درخواست کی اور کہا کہ: میرے آقا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ فرمایا: میں تمہارا نیلام کروں گا اور تمہیں فروخت کروں گا۔ اس نے کہا کہ: ہماری قیمت آپ کس مد میں صَرف کریں گے؟ فرمایا: مسلمانوں کے کاموں میں! اس نے عرض کیا کہ: قیمت وصول کون کرے گا؟ فرمایا: میں خود! اس نے کہا: بہت اچھا! چنانچہ شیخ نے ایک ایک کرکے سب اُمراء کو نیلام کیا، ہر ایک پر بولی بولی گئی، شیخ نے (ان کے اعزاز کے طور پر) ان کے دام بہت لگائے، اور بہت بڑی بولی پر ان کو فروخت کیا، اور قیمت وصول کرکے خیر کے کاموں میں صَرف کی، وہ آزاد ہوکر اپنے اپنے گھر گئے۔ ابن السبکی لکھتے ہیں کہ: یہ واقعہ کسی اور کے متعلق سننے میں نہیں آیا۔ ایک عالم کی عظمت اور اس کے رُعب وداب

کی یہ انتہائی مثال ہے۔

مشاہد ومزارات پر حصولِ مقصد کے افسانے.....اس سلسلے میں ایک بڑا فتنہ یہ پھیل رہا تھا کہ ان مشاہد اور زیارت گاہوں میں بڑے بڑے مریضوں کو شفا ہوتی ہے اور دُعائیں قبول ہوتی ہیں، لوگ اس سلسلے میں اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے بیان کرتے تھے، اِمام ابن تیمیہ کو اللہ تعالیٰ نے رُسوخ فی الدین اور ایمان ویقین کا جو مقام عطا فرمایا تھا، اس کی بناء پر وہ ان افواہوں اور دعووں سے متأثر ہونے والی نہیں تھے، اور قطعیاتِ دِین اور منصوصاتِ کتاب وسنت کو ان روایات وبیانات کی بناء پر نہیں چھوڑ سکتے تھے، انہوں نے اپنی خداداد فراست اور دِینی فہم سے کام لیا اور ثابت کیا کہ یہ سب توہمات اور بے اصل باتیں ہیں، اس سلسلے میں زیادہ تر جانوروں کے شفایاب ہونے کے واقعات بیان کئے جاتے تھے، اِمام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی جو وجہ بیان کی ہے، وہ بہت عجیب وغریب اور بصیرت افروز ہے، وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''قاہرہ میں ایک گروہ عبیدین (مشہور بہ فاطمیین) کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ اولیائے صالحین میں سے تھے، میں نے جب ان سے کہا کہ وہ تو منافق و زندیق تھے، اور ان میں سب سے کم اور ہلکے درجے کے وہ تھے جو رافضی تھے، تو ان کو بڑا تعجب ہوا اور وہ کہنے لگے کہ: ہم تو ایسے گھوڑوں کو جن کے پیٹ میں درد ہوتا ہے، ان کے مشاہد ومزارات پر لے جاتے ہیں، اور وہ وہاں اچھے ہو جاتے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ: یہ تو ان کے کفر کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ میں نے بعض سائیسوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ: تم شام اور مصر میں جب گھوڑوں کے پیٹ میں درد ہوتا ہے تو ان کو کہاں لے جاتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ: ہم شام میں ان قبروں کے پاس لے جاتے ہیں جو اسماعیلیوں کے علاقے میں ہیں، جیسے علیقہ اور منقیہ وغیرہ اور مصر میں ہم عیسائیوں کی ایک خانقاہ میں لے جاتے ہیں اور عبیدیوں کی قبر پر۔ میں نے کہا: کیا تم ان کو صلحائے مسلمین کی قبروں کے

پاس بھی لے جاتے ہو، مثلاً حضرت لیث بن سعد، اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ابن القاسم وغیرہ؟ انہوں نے کہا: نہیں! میں نے ان عقیدت مندوں سے کہا کہ: لو سنو! یہ ان گھوڑوں کو کفار و منافقین کی قبروں کے پاس لے جاتے ہیں اور ان کو شفا ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے، اور جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ چوپائے اور بہائم مُردوں کی آوازیں سنتے ہیں، تو جب یہ گھوڑے اس قسم کی آوازیں سنتے ہیں، گھبرا جاتے ہیں، اور اسی گھبراہٹ اور ہیبت سے ان کے پیٹ پانی ہو جاتے ہیں، اور وہ پاخانہ کر دیتے ہیں، اس لئے کہ ہیبت و دہشت سے اکثر اِسہال ہو جاتا ہے۔ ان کو اس پر بڑا تعجب ہوا، میں اکثر لوگوں سے یہی سبب بیان کرتا تھا، اور مجھے علم نہیں تھا کہ کسی اور نے بھی یہ بات لکھی ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ بعض علماء نے یہی سبب بیان کیا ہے۔''

جہیز کیا ہوتا ہے؟..... چند سال پہلے شام کے ایک بزرگ شیخ عبدالفتاح دارالعلوم کراچی تشریف لائے ہوئے تھے، اتفاق سے ایک شخص نے ان سے دُعا کی درخواست کرتے ہوئے کہا کہ: میری دو بیٹیاں شادی کے لائق ہیں، دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی شادی کے اسباب پیدا فرمادے۔ شیخ نے ان سے پوچھا کہ: کیا ان کے لئے کوئی مناسب رشتہ نہیں مل رہا؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ: رشتہ تو دونوں کا ہو چکا ہے، لیکن میرے پاس اتنے مالی وسائل نہیں ہیں کہ ان کی شادی کرسکوں۔ شیخ نے یہ سن کر انتہائی حیرت سے پوچھا کہ: وہ آپ کی لڑکیاں ہیں یا لڑکے ہیں؟ کہنے لگے کہ: لڑکیاں ہیں۔ شیخ نے سراپا تعجب بن کر کہا: لڑکیوں کی شادی کے لئے مالی وسائل کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے کہا کہ: میرے پاس انہیں جہیز میں دینے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ شیخ نے پوچھا: جہیز کیا ہوتا ہے؟ اس پر حاضرینِ مجلس نے انہیں بتایا کہ ہمارے ملک میں یہ رواج ہے کہ باپ شادی کے وقت اپنی بیٹی کو زیور، کپڑے، گھر کا اثاثہ اور بہت سا ساز و سامان دیتا ہے، اسے جہیز کہتے ہیں، اور جہیز دینا باپ کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے، جس کے بغیر لڑکی کی شادی کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور لڑکی کے سسرال والے بھی اس کا مطالبہ

کرتے ہیں۔ شیخ نے یہ تفصیل سنی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ: کیا بیٹی کی شادی کرنا کوئی جرم ہے جس کی یہ سزا باپ کو دی جائے؟ پھر انہوں نے بتایا کہ: ہمارے ملک میں اس قسم کی کوئی رسم نہیں، اکثر جگہوں پر تو یہ لڑکے کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ اپنے گھر میں دُلہن کو لانے سے پہلے گھر کا اثاثہ اور دُلہن کی ضروریات فراہم کر کے رکھے، لڑکی کے باپ کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑتا۔ اور بعض جگہوں پر رواج یہ ہے کہ لڑکی کی ضروریات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سامان تو باپ ہی خریدتا ہے، لیکن اس کی قیمت لڑکا ادا کرتا ہے، البتہ باپ اپنی بیٹی کو رُخصت کرتے وقت کوئی مختصر تحفہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے، لیکن وہ بھی ایسا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔

اس واقعے سے کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں جہیز کو جس طرح بیٹی کی شادی کا ایک ناگزیر حصہ قرار دے دیا گیا ہے، اس کے بارے میں عالم اسلام کے دُوسرے علاقوں کا کیا نقطۂ نظر ہے؟

شرعی اعتبار سے جہیز کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر کوئی باپ اپنی بیٹی کو رُخصت کرتے وقت اسے کوئی تحفہ اپنی استطاعت کے مطابق دینا چاہے تو دیدے، لیکن نہ وہ شادی کے لئے کوئی لازمی شرط ہے، نہ سسرال والوں کو کوئی حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کا مطالبہ کریں، اور اگر کسی لڑکی کو جہیز نہ دیا جائے یا کم دیا جائے تو اس پر بُرا منائیں، یا لڑکی کو مطعون کریں، اور نہ یہ کوئی دِکھاوے کی چیز ہے کہ شادی کے موقع پر اس کی نمائش کر کے اپنی شان وشوکت کا اظہار کیا جائے۔

جہیز یا کنیادان کی رسم..... ہندو اپنی لڑکی کو گھر سے نکالتے وقت ''کنیادان'' کی جو رسم ادا کرتے ہیں، اس کا مطلب یہی ہے کہ لڑکی کا باپ اپنی لڑکی کو بطور ''ہبہ'' داماد کے حوالے کر دیتا ہے، اس لئے والدین جو کچھ دینا چاہتے ہیں اسی وقت دے دیتے ہیں، گویا یہ اعلان ہوتا ہے کہ لڑکی باپ کے خاندان سے نکل کر شوہر کے خاندان کا ایک جزء بن چکی ہے، اور اب وہ کسی صورت میں دوبارہ اپنے خاندان میں واپس نہیں آسکتی، اور نہ ہی باپ یا بھائی پر اس کا کوئی حق عائد ہوتا ہے، چنانچہ اسے میراث میں سے کچھ نہیں دیا جاتا، اسی لئے ہندو عورت کے پاس بیوہ ہونے کے بعد گھٹ گھٹ کر مرنے یا بیوگی کی زندگی گزارنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہتا۔

پرہیزگاری کے لئے دس چیزیں

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: جب تک آدمی اپنے اُوپر دس چیزوں کو فرض نہ کرے اس کی پرہیزگاری پوری نہیں ہوتی:

① .....اپنی زبان کو غیبت سے بچائے۔

② .....بُرے گمان سے پرہیز کرے۔

③ .....ٹھٹھے اور مذاق سے بچے۔

④ .....حرام چیزوں سے اپنی نگاہ بند رکھے۔

⑤ .....سچ بولے۔

⑥ .....اپنے اُوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات سمجھے، تاکہ وہ مغرور نہ ہو جائے۔

⑦ .....اپنے مال کو حق میں خرچ کرے، باطل میں خرچ نہ کرے۔

⑧ .....اپنے لئے بڑائی اور بلندی طلب نہ کرے۔

⑨ .....نمازوں کی حفاظت کرے۔

⑩ .....سنت اور جماعت پر استقامت رکھے۔

آگ میں آگ.....ایک فلسفی نے اپنے تین سوال مشتہر کئے اور اعلان کیا کہ میرے ان تین سوالوں کا کوئی عالم جواب دے تو میں مان جاؤں گا، سوال یہ تھے:

① .....اللہ کو جب کسی نے دیکھا نہیں تو پھر کلمے میں "أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" پڑھ کر کیوں کہا جاتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، یہ بغیر دیکھے کے گواہی کیوں؟

② .....جو کرتا ہے، اللہ کرتا ہے، پھر کسی گناہ پر بندہ مجرم کیوں ہو؟ جبکہ کرنے والا خدا ہے۔

③ .....شیطان اَز رُوئے قرآن آگ سے بنا ہوا ہے، اور خدا اسے دوزخ کی آگ میں ڈالے گا، تو اس کا کیا بگڑ سکتا ہے؟ کیونکہ دوزخ میں اگر آگ ہے، تو شیطان خود بھی آگ ہے، پھر آگ میں آگ ڈال دی جائے تو آگ کا کیا نقصان؟

کئی دن تک اس کے سوالوں کا جواب نہ ملا، تو لگا وہ علماء اور دِین و مذہب کے خلاف بکنے، اتفاقاً ایک روز شہر سے باہر نکلا تو باہر میدان میں ایک مجذوب بزرگ بیٹھے تھے، اور اُن کے پاس مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے پڑے تھے، اس بزرگ نے اسے اپنے پاس بلایا اور پوچھا: سنا ہے آپ کے کچھ سوال ہیں، اور آپ کو گلہ ہے کہ کسی نے ان کا جواب نہیں دیا، فلسفی نے کہا: ہاں! یہی بات ہے، اور میرے وہ سوال ہی ہیں لا جواب۔ بزرگ نے فرمایا: وہ سوال ذرا مجھے بھی تو سناؤ، ممکن ہے میں جواب دے سکوں۔ فلسفی نے اپنے سوال دُہرا دیئے:

① .....خدا کو بغیر دیکھے اس کی گواہی کیوں دی جاتی ہے؟

② .....جو کرتا ہے، خدا کرتا ہے، پھر بندہ مجرم کیوں؟

③ .....شیطان خود آگ ہے، اُسے دوزخ میں ڈالا گیا تو آگ میں آگ کا کیا نقصان ہے؟

بزرگ فرمانے لگے: میں دُوں ان تینوں سوالوں کا جواب؟ اس نے کہا: دیجئے! آپ ہی دیجئے۔ انہوں نے ایک بہت بڑا مٹی کا ڈھیلا اُٹھایا اور فلسفی کے سر پر دے مارا، فلسفی کا سر پھٹ گیا اور اُس نے شور مچا دیا کہ تم نے میرا سر کیوں پھاڑ دیا؟ بزرگ فرمانے لگے: تمہارے تینوں سوالوں کا ایک ہی جامع جواب دیا ہے۔ وہ بولا: یہ جواب ہے یا شرارت؟ میں ابھی عدالت میں جاتا ہوں، چنانچہ فلسفی عدالت میں گیا اور اُس بزرگ پر دعویٰ کر دیا، بزرگ کے نام سمن آئے، اور وہ عدالت میں پیش ہوئے، ایک طرف وہ، دُوسری طرف فلسفی سر پکڑے کھڑا تھا، جج نے پوچھا: کیا تم نے اس کے سر پر ڈھیلا مارا؟ وہ بولے: ہاں مارا! جج نے کہا: کیوں مارا؟ فرمایا: اس کے تینوں سوالوں کا جواب دیا ہے! جج نے پوچھا: وہ کیسے؟ فرمایا: وہ ایسے کہ اس کا پہلا سوال یہ تھا کہ خدا کو دیکھے بغیر اس کی گواہی کیوں دی جاتی ہے؟ اب میں اس سے پوچھتا ہوں، کیوں صاحب! میں نے جو آپ کو ڈھیلا مارا ہے، تو آپ کے سر پر کیا ہوا ہے؟ فلسفی بولا: سر پھٹ گیا ہے اور سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ فرمایا: جو درد ہو رہا ہے اس کی گواہی کون دے گا؟ وہ بولا: میں خود گواہی دیتا ہوں کہ مجھے درد ہو رہا ہے۔ فرمایا: مگر یہ تم نے یہ

درد دیکھا بھی ہے یا بغیر دیکھے کے گواہی دے رہے ہو؟ بولا: دیکھا تو نہیں لیکن محسوس تو ہو رہا ہے۔ فرمایا: خدا ہم نے دیکھا تو نہیں لیکن وہ اپنی قدرت سے معلوم تو ہو رہا ہے۔ فلسفی نے کہا: ٹھیک ہے، پہلا سوال حل ہو گیا۔

بزرگ پھر بولے کہ: تمہارا سوال یہ تھا کہ جو کرتا ہے، خدا کرتا ہے، بندے کا تعلق کیا؟ پھر وہ کیوں پکڑا جائے گا؟ تو جناب! اگر یہی بات ہے تو پھر سمن تم نے میرے نام کیوں نکلوائے؟ ڈھیلا بھی خدا نے ہی مارا ہے، میرا کیا قصور؟ فلسفی بولا: دُوسرا سوال بھی حل ہو گیا، لیکن میرا تیسرا سوال ابھی باقی ہے۔ فرمایا: ہاں! ہاں! اُس کا جواب بھی ہو چکا، وہ سوال یہ تھا کہ شیطان بھی آگ کا اور دوزخ میں بھی آگ، پھر آگ میں آگ کا کیا نقصان؟ فرمایا: تم کس چیز کے بنے ہو؟ بولا: مٹی کا بنا ہوں! فرمایا: اور جو ڈھیلا میں نے تمہیں مارا ہے، یہ کس چیز کا بنا ہے؟ بولا: یہ بھی مٹی کا بنا ہے! فرمایا: بس جس طرح مٹی نے مٹی کو لہولہان کر دیا ہے، اسی طرح آگ بھی آگ کا بیڑہ غرق کر دے گی۔

فلسفی نے کہا: خوب! میرے تینوں مسئلے حل ہو گئے، سر پھٹ گیا، لیکن شک ہٹ گیا میں اپنا دعویٰ واپس لیتا ہوں۔

ایک عابد کا شیطان سے مقابلہ..... ایک عابد عرصہ دراز سے خدا کی عبادت کرتا رہا، ایک روز کچھ لوگ اس کے پاس آئے اور کہا کہ: فلاں قوم خدا کو چھوڑ کر فلاں درخت کو پوجتی ہے۔ یہ سن کر عابد غصّے کی وجہ سے آگ بگولا ہو گیا، اور اس درخت کے کاٹنے کے لئے کندھے پر کلہاڑا رکھ کر چلا، راستے میں ایک بوڑھے کی صورت میں اِبلیسِ ملعون ملا اور کہنے لگا: جناب! کہاں کا ارادہ ہے؟

عابد: فلاں درخت کاٹنے کو جا رہا ہوں، جس کو فلاں قوم خدائے وحدہٗ لاشریک کو چھوڑ کر پوجتی ہے۔

اِبلیس: اجی چھوڑیئے بھی اس خیال کو، اس سے کیا مطلب؟ اپنی عبادت میں لگئے۔

عابد: شرک مٹانا بھی عبادت ہے۔

اِبلیس: میں ہرگز نہ کاٹنے دُوں گا۔

یہ سن کر عابد کو غصہ آیا اور اِبلیس کو پکڑ کر زمین پر دے مارا، اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا، اِبلیس مجبور ہو کر کہنے لگا کہ: حضرت! بات تو سنئے، آپ تو بہت ناراض ہو گئے، ذرا اُتریئے، آپ کو کچھ سمجھاؤں۔ یہ سن کر عابد اس کے سینے سے اُتر گیا اور دونوں میں اس طرح بات چیت شروع ہو گئی۔

عابد: کہو کیا کہتے ہو؟

اِبلیس: آپ کے ذمے اس کا کاٹنا فرض تو ہے نہیں، اور نہ آپ اس کو پوجتے ہیں، دُوسروں کے عمل سے آپ کو کیا بحث؟

عابد: جی میں دلیلیں نہیں سنتا، اس کو ضرور ہی کاٹوں گا۔

یہ سن کر اِبلیس نے پھر کچھ کہا اور پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عابد نے اِبلیس کو زیر کر لیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا، اِبلیس نے عاجز ہو کر ایک بات بتائی اور کہا کہ: ذرا مجھ کو چھوڑ دو تا کہ آپ کو ایک بہترین اور مفید مشورہ دُوں۔ یہ سن کر عابد اس کے سینے سے اُتر گیا اور اِبلیس سے مخاطب ہو کر کہا: کہو کیا کہتے ہو؟

اِبلیس: آپ فقیر آدمی ہیں، شب و روز عبادت میں لگے رہتے ہیں، اور دُوسرے مسلمان آپ کا خرچہ برداشت کرتے ہیں، غالباً آپ ضرور چاہتے ہوں گے کہ جس طرح دُوسروں پر آپ کو عملی فوقیت حاصل ہے، اسی طرح آپ کی مالی حیثیت بھی اچھی ہو جائے، اگر آپ منظور کریں تو میں روزانہ رات کو آپ کے تکیے کے نیچے دو اشرفیاں رکھ دیا کروں اور آپ ان کو خرچ کر لیا کریں، فی سبیل اللہ خیرات کریں اور خود کھائیں اور دُوسروں کو کھلائیں، مگر یہ جب ہے کہ آپ اس درخت کو کاٹنے سے باز رہیں، اور درحقیقت اس کو کاٹنا آپ کے لئے اور مسلمانوں کے لئے مفید بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کی پرستش غیر قومیں کرتی ہیں۔ دُوسری بات یہ ہے کہ مشرک مانیں گے ہرگز نہیں، کیونکہ وہ کسی دُوسرے درخت کو پوجنے لگیں گے۔

بات عابد کی سمجھ میں آ گئی اور اِبلیس سے ایفائے عہد کا وعدہ لے کر اپنے عبادت خانے

میں واپس چلا گیا۔ حسبِ وعدہ اِبلیس نے رات کو دو اشرفیاں اس کے سرہانے رکھ دیں اور عابد نے لے لیں۔ دُوسرے اور تیسرے دن بھی ایسا ہی ہوا، مگر چوتھے روز اِبلیس نے کچھ نہ رکھا، عابد نے دیکھا کہ تکیے کے نیچے کچھ نہیں ہے، یہ دیکھتے ہی لال پیلا ہو گیا اور کلہاڑا لے کر پھر درخت کاٹنے کو چل دیا، راستے میں اِبلیس پھر اسی صورت میں ملا اور آپس میں گفتگو شروع ہو گئی۔

اِبلیس: جی حضور! کہاں کا رُخ ہے؟

عابد: فلاں درخت کاٹنے کو جا رہا ہوں۔

اِبلیس: آپ اس کو نہیں کاٹ سکتے۔

عابد: چخ چخ نہ کرو، ورنہ تم کو بھی دُرست کر دُوں گا۔

اِبلیس: معاف کیجئے جناب! وہ دن ہوا ہوئے۔

یہ سن کر عابد نے اِبلیس کو پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا مگر اِبلیس نے عابد کو پچھاڑ دیا اور عابد کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور عابد دَم بخود رہ گیا۔ اِبلیس نے کہا: اس درخت کے کاٹنے سے توبہ کرو ورنہ ابھی تجھے ذبح کرتا ہوں۔ عابد نے بڑی مشکل سے کہہ سن کر اپنی جان بچائی اور اپنی ہار مان کر اِبلیس سے پوچھا کہ: یہ تو بتاؤ کہ پہلی دو مرتبہ میں تجھ پر کیسے غالب آ گیا اور اب کی مرتبہ تم نے مجھے کیوں پچھاڑ لیا؟ اِبلیس نے کہا کہ: اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تمہارا غصہ اللہ کے لئے تھا اور اب تمہارا غصہ اس لئے تھا کہ رقم نہ ملی۔

شیطان کی چالیں..... احادیث شریفہ سے معلوم ہوا کہ شیاطین قضائے حاجت کی جگہوں میں رہتے ہیں، بسم اللہ پڑھ کر داخل ہونا چاہئے، اس کے ساتھ کوئی اور دُعا بھی پڑھیں۔ ''بسم اللہ'' شیاطین کی آنکھوں میں آڑ بن جائے گی۔ ناپاک جگہوں سے شیاطین کو خاص تعلق ہے، جو لوگ ان سے متعلق ہیں انہیں بھی گندگی پسند ہوتی ہے، جادوگروں کو دیکھا ہوگا کہ میلے کچیلے رہتے ہیں، ان کے بدن سے بدبو آتی ہے، اور جو لوگ سفلی عمل کرتے ہیں ناپاکی کھا کر عمل کرتے ہیں۔ شیاطین وضو کرنے والوں کو بھی ستاتے ہیں اور ہمدرد بن کر آتے ہیں یوں کہتے

ہیں کہ: وضو میں فلاں چیز دھونا رہ گیا، اسی طرح برابر بار بار ایک عضو کو دھلواتے ہیں اور اس طرح سے پانی اور وقت دونوں ضائع کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ علماء نے فرمایا کہ: شیطان سب سے پہلے وضو میں وسوسہ ڈالتا ہے، اس میں کامیاب ہو جائے تو پھر دُوسری چیزوں میں بھی وسوسہ لاتا ہے، نماز میں بھی حاضر ہو جاتا ہے اور نمازی کو وہ وہ باتیں یاد دِلاتا ہے جو اس وقت یاد آنے والی بھی نہ تھیں۔ شیطان گھروں میں بھی ساتھ رہنے کی کوشش کرتا ہے اور ساتھ کھانے کی بھی، نیز سفر میں بھی ساتھ رہتا ہے، تنہا مسافر کو ستاتا ہے، راستوں اور گلیوں میں کھیلنے والے بچوں کو بھی تکلیف پہنچاتا ہے، مسلمانوں کو آپس میں لڑواتا ہے، میاں بیوی میں پھوٹ ڈال کر طلاق دِلوانے کی کوشش کرتا ہے، جماع کے وقت بھی حاضر ہو جاتا ہے اور بھی اس کی بہت سی حرکتیں ہیں۔ لوگوں کے عقائد بگاڑنے کے لئے اور انہیں شرک پر ڈالنے کے لئے اور اہلِ کفر کا معتقد بنانے کے لئے بھی شیطان بہت سی حرکتیں کرتا ہے، کاہنوں کے کان میں باتیں ڈالتا ہے تاکہ غیب کی باتیں سنائیں اور لوگ ان کے پاس جائیں۔ نوعمر لڑکوں کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور پُرانی باتیں سناتا ہے جو اسے معلوم اور یاد ہوتی ہیں، یہ باتیں لڑکوں کی زبان سے نکلتی ہیں اور اس طرح سے ہندوؤں کو عقیدۂ آواگون کا معتقد بناتا ہے، جس سے قیامت کا انکار لازم آتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی نے بتایا کہ: میری آنکھ پھڑکنے لگتی تھی تو میں فلاں یہودی کے اس چلی جاتی تھی، جب وہ جھاڑ پھونک کر دیتا تھا تو میری آنکھ کا پھڑکنا بند ہو جاتا تھا، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: حقیقت میں شیطان اپنے ہاتھ سے آنکھ میں مار دیتا تھا، پھر یہودی کے دَم کرنے پر رُک جاتا تھا۔ (مشکوٰۃ المصابیح، ص:۳۸۹)

اس سے معلوم ہوا کہ کافروں اور مشرکوں کو معتقد بنانے کے لئے شیطان ایسی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ کہیں پڑھا تھا کہ قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ایک گاؤں میں تشریف لے گئے، ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا، بارش ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کے مندر میں چلے، حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جو شخص تھا اس نے جوتا لے کر

ایک بت کو پیٹنا شروع کیا اور مذاق میں کہنے لگا کہ: لا کوئی کھانے کو دے، تھوڑی دیر میں ایک شخص آیا جو کھانے کا ایک طبق لئے ہوا تھا، جس شخص نے جوتے مارے تھے اس کو بڑا تعجب ہوا کہ نا سمجھ بت کی پٹائی سے یہ کھانا کیسے آیا؟ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: یہ شیطانی حرکت ہے، جب تو نے اس کو پیٹنا شروع کیا تو شیطان ہندوؤں کے کسی گھر میں جا کر کسی عورت پر سوار ہو گیا اور ان سے کہا کہ مندر میں کھانے کو بھیجو تو میں اُتر جاؤں گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے کھانا بھیج دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان کا ایمان بگاڑنے کے لئے اور مشرکین کو بت پرستی پر جمائے رکھنے کے لئے شیاطین کا یہ ایک طریقہ بھی ہے کہ مشرکین کی عورتوں پر سوار ہو جاتے ہیں اور ان سے شرکیہ اعمال کرواتے ہیں اور جب وہ ایسے اعمال کر لیتے ہیں تو شیاطین دُور ہو جاتے ہیں، جس سے مشرکین کے شرکیہ عقائد میں مزید پختگی آجاتی ہے اور ان باتوں کو دیکھ کر وہ بتوں کی عبادت میں اپنا نفع اور ضرر سے حفاظت کا عقیدہ مضبوط کر لیتے ہیں، مشرکوں میں شیاطین کو بھگانے کی ہمت نہیں ہوتی، وہ تو ان کو اپنا دیوتا کہتے ہیں اگر شیاطین مسلمان کے پاس آئیں تو وہ آیۃ الکرسی پڑھ دیتے ہیں جس سے شیاطین بھاگ جاتے ہیں۔

''آکام المرجان'' صفحہ: ۲۵ میں لکھا ہے کہ: وہ بدعتی گمراہ لوگ جو غیر شرعی طریقے پر عبادت اختیار کرتے ہیں اور پیر فقیر بنے رہتے ہیں کبھی کبھی انہیں مکاشفات ہوتے ہیں، وہ بہت سی مرتبہ شیاطین کے رہنے کی جگہوں میں جہاں ناپاک چیزیں کوڑا کچرا پڑا رہتا ہے، چلے جاتے ہیں، جب یہ لوگ وہاں جاتے ہیں تو شیاطین ان کے پاس آتے ہیں اور بعض اُمور میں ان سے باتیں کرتے ہیں، جیسے کاہنوں سے مخاطب ہوتے ہیں (اور یہ لوگ اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ ہم بزرگ ہو گئے) حالانکہ یہ شیطان کے مبتلا کئے ہوئے مکاشفات اور مکالمات پر بھروسہ کئے ہوتے ہیں۔

صاحبِ آکام المرجان مزید لکھتے ہیں کہ شیاطین بتوں کے اندر گھس جاتے ہیں اور بتوں کی عبادت کرنے والوں سے باتیں کرتے ہیں، اور انہیں فتنے میں ڈالتے ہیں، جیسا کہ

جادوگروں کو بھی فتنے میں مبتلا کرتے ہیں، نیز بتوں اور چاند، سورج، ستاروں کی عبادت کرنے والوں کو بھی فتنے میں ڈالتے ہیں، یہ لوگ ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں اور ان کے لئے دھونی وغیرہ جلاتے ہیں، حقیقت میں ان پر شیطان نازل ہوتے ہیں اور یہ ان کو ستاروں کی رُوحانیت سمجھتے ہیں۔ شیاطین کے ذریعے ان کی بعض حاجتیں بھی پوری ہو جاتی ہیں، مثلاً کسی کو قتل کروانا یا مرض میں مبتلا کر دینا، کسی کا مال منگا لینا، یہ شیطانی کام ہوتے ہیں جنھیں وہ اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، حالانکہ اس کا نقصان بہت زیادہ ہے (کفر وشرک کی وجہ سے جو آخرت میں مبتلائے عذاب ہوں گے ان کو اس کا دھیان بالکل نہیں ہے۔)

آکام المرجان صفحہ:۱۰۳ پر بھی لکھا ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو اپنی حاجتوں کے لئے غیر اللہ کو پکارتے ہیں، ان کو کفر پر جمانے کے لئے شیطان یہ حرکت کرتا ہے کہ جس کو مدد کے لئے پکارا گیا وہ مردہ ہو یا زندہ اس کی صورت میں آکر موجود ہو جاتا ہے اور پکارنے والے کو نظر آتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ فلاں بزرگ میرے سامنے کھڑے ہیں، حالانکہ وہ شیطان ہوتا ہے۔ اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ یہ شیاطین جس زندہ شخص کی صورت میں آئے اور اس سے معلوم کیا گیا کہ آپ وہاں فلاں وقت فلاں جگہ موجود تھے تو وہ منکر ہو گیا، اس نے کہا: مجھے تو پتہ بھی نہیں، میں تو اس جگہ نہیں گیا۔

مزید لکھتے ہیں (صفحہ:۱۰۴) بعض مرتبہ شیاطین یہ بھی کرتے ہیں کہ عوام میں جس کی بزرگی مشہور ہو گئی، اس کی صورت میں یومِ عرفہ میں عرفات میں موجود ہوتے ہیں اور جن لوگوں نے شیطان کو اس کی صورت میں دیکھ لیا، ان کے بارے میں آکر نقل کرتے ہیں، آپ نے حج کیا ہے، ہم نے عرفات میں آپ کو دیکھا ہے، دُوسرے مریدین کہتے ہیں کہ: آپ تو یہیں موجود تھے، اس طرح دونوں فریق کی اور زیادہ عقیدت بڑھ جاتی ہے، اور خود وہ صاحب بھی اپنے بارے میں دھوکا کھا جاتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ دیکھو! میں کتنی بڑی کرامت والا ہوں کہ میں ذی الحجہ کی نو تاریخ کو دونوں جگہ تھا۔

نیز (صفحہ:۱۰۶) یہ بھی لکھا ہے کہ جنات میں بدلہ لینے کا رواج ہے، اگر کسی انسان سے

انہیں تکلیف پہنچ گئی اور یا یہ گمان کرلیا کہ اس نے تکلیف دینے کا ارادہ کیا ہے، مثلاً کسی انسان نے کسی جگہ پیشاب کرلیا یا کسی جگہ گرم پانی ڈال دیا یا کسی جنی کو (سانپ وغیرہ سمجھ کر) قتل کردیا تو جنات اس کا بدلہ لے لیتے ہیں، اگرچہ انسانوں کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ہماری وجہ سے کسی جن کو تکلیف پہنچی۔ مزید لکھا ہے کہ جنات میں ظلم بھی ہے، جہالت بھی، اس سے زیادہ بدلہ لیتے ہیں جس کا کوئی مستحق ہو، بلکہ بعض مرتبہ بلاوجہ محض کھیلنے کے طور پر انسانوں کو تکلیف دیتے ہیں، جیسے بہت سے بے وقوف انسان بھی ایسا کرتے ہیں۔

ایک عبرت ناک واقعہ..... حافظ ابن کثیر نے ایک عبرت ناک واقعہ بروایت ابن جریر و ابن ابی حاتم عن مجاہد لکھا ہے، کہ پہلی اُمتوں میں ایک عورت تھی، اس کو جب وضع حمل کا وقت شروع ہوا اور تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہوا، تو اس نے اپنے ملازم کو آگ لینے کے لئے بھیجا، وہ دروازے سے نکل ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آدمی ظاہر ہوا اور اس نے پوچھا کہ: یہ عورت کیا جنی ہے؟ ملازم نے جواب دیا کہ: ایک لڑکی ہے، تو اس آدمی نے کہا کہ: آپ یاد رکھئے! یہ لڑکی سو ۱۰۰ مردوں سے زنا کرے گی، اور آخر ایک مکڑی سے مرے گی۔ ملازم یہ سن کر واپس ہوا اور فوراً ایک چھری لے کر اس لڑکی کا پیٹ چاک کردیا، اور سوچا کہ اب یہ مرگئی ہے تو بھاگ گیا۔ مگر پیچھے لڑکی کی ماں نے ٹانکے لگا کر اس کا پیٹ جوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ لڑکی جوان ہوگئی، اور خوبصورت اتنی تھی کہ اُس شہر میں وہ بے مثال تھی، اور اس ملازم نے بھاگ کر سمندر کی راہ لی، اور کافی عرصے تک مال و دولت کماتا رہا، اور پھر شادی کرنے کے لئے واپس شہر آیا، اور یہاں اس کو ایک بڑھیا ملی تو اس سے ذکر کیا کہ میں ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس سے زیادہ کوئی خوبصورت اس شہر میں اور کوئی نہ ہو، اس عورت نے کہا کہ: فلاں لڑکی سے زیادہ کوئی خوبصورت نہیں ہے، آپ اسی سے شادی کرلیں۔ آخر کار کوشش کی اور اس سے شادی کرلی، تو اس لڑکی نے مرد سے دریافت کیا کہ تم کون ہو؟ اور کہاں رہتے ہو؟ اس نے کہا کہ: میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں، لیکن ایک لڑکی کا میں پیٹ چاک کرکے بھاگ گیا تھا، پھر اس نے پورا واقعہ سنایا، یہ سن کر وہ بولی کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں، یہ کہہ کر اس نے اپنا پیٹ دِکھایا، جس پر نشان

موجود تھا، یہ دیکھ کر اس مرد نے کہا کہ: اگر تو وہی عورت ہے تو تیرے متعلق دو باتیں بتلاتا ہوں، ایک یہ کہ تو سو ۱۰۰ مردوں سے زنا کرے گی، اس پر عورت نے اقرار کیا کہ: ہاں مجھ سے ایسا ہوا ہے، لیکن تعداد یاد نہیں، مرد نے کہا: تعداد سو ۱۰۰ ہے، دُوسری بات یہ کہ تو مکڑی سے مرے گی۔

مرد نے اس کے لئے ایک عالی شان محل تیار کرایا، جس میں مکڑی کے جالے کا نام تک نہ تھا، ایک دن اسی میں لیٹے ہوئے تھے کہ دیوار پر ایک مکڑی نظر آئی، عورت بولی: کیا مکڑی یہی ہے جس سے تو مجھے ڈراتا ہے؟ مرد نے کہا: ہاں! اس پر وہ فوراً اُٹھی اور کہا کہ: اس کو تو میں فوراً مار دُوں گی، یہ کہہ کر اس کو نیچے گرایا اور پاؤں سے مسل کر ہلاک کر دیا۔

مکڑی تو ہلاک ہوگئی لیکن اس کی زہر کی چھینٹیں اس کے پاؤں اور ناخنوں پر پڑ گئیں، جو اس کی موت کا پیغام بن گئیں۔ (ابن کثیر)

یہ عورت صاف ستھرے شاندار محل میں اچانک ایک مکڑی کے ذریعے ہلاک ہوگئی، اس کے بالمقابل کتنے ایسے آدمی ہیں کہ عمر بھر جنگوں اور معرکوں میں گزار دی، وہاں موت نہ آئی، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جو اسلام کے سپاہی اور جرنیل معروف و مشہور ہیں، اور ''سیف اللہ'' ان کا لقب ہے، پوری عمر شہادت کی تمنا میں جہاد میں مصروف رہے، اور ہزاروں کافروں کو تہہ تیغ کیا، ہر خطرے کی وادی کو بے خوف و خطر عبور کیا، اور ہمیشہ یہی دُعا کرتے تھے کہ میری موت عورتوں کی طرح چارپائی پر نہ ہو، بلکہ ایک نڈر سپاہی کی طرح میدانِ جہاد میں ہو، لیکن آخر کار ان کی موت بستر پر ہی ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ زندگی اور موت کا نظام قادرِ مطلق نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے، جب وہ چاہے تو آرام کے بستر پر ایک مکڑی کے ذریعے مار دے اور بچانا چاہے تو تلواروں کی چھاؤں میں بچا لے۔

اقسامِ سفر..... اِمام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے ہجرت اور ترکِ وطن کی قسمیں اور ان کے کچھ اَحکام پر ایک مفید مضمون تحریر فرمایا ہے، اِتمام فائدہ کے لئے اس کو نقل کرتا ہوں۔

قرطبی نے بحوالہ ابن عربی لکھا ہے کہ وطن سے نکلنا اور زمین میں سفر کرنا کبھی تو کسی چیز

سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہوتا ہے، اور کبھی کسی چیز کی طلب وجستجو کے لئے، پہلی قسم کا سفر جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے ہو اس کو ہجرت کہتے ہیں اور اس کی چھ قسمیں ہیں۔

اوّل، یعنی دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف جانا، یہ قسم سفر عہدِ رسالت میں بھی فرض تھی، اور قیامت تک بشرطِ استطاعت وقدرت فرض ہے (جبکہ دار الکفر میں اپنے جان و مال اور آبرو کا امن نہ ہو، یا دِینی فرائض کی ادائیگی ممکن نہ ہو) اس کے باوجود دار الحرب میں مقیم رہا تو گناہگار ہوگا۔

دُوسرا دار البدعت سے نکل جانا، ابن قاسم کہتے ہیں کہ میں نے اِمام مالکؒ سے سنا ہے کہ کسی مسلمان کے لئے اس مقام میں قیام کرنا حلال نہیں جس میں سلف صالحین پر سب وشتم کیا جاتا ہو، ابن عربی یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ بالکل صحیح ہے، کیونکہ اگر تم کسی منکر کا ازالہ نہیں کر سکتے تو تم پر لازم ہے کہ خود وہاں سے زائل یعنی علیحدہ ہو جاؤ، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

''وَاِذَا رَأَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِی اٰیٰتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْھُمْ''۔

تیسرا سفر وہ ہے کہ جس جگہ پر حرام کا غلبہ ہو وہاں سے نکل جانا، کیونکہ طلبِ حلال ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چوتھا جسمانی اذیتوں سے بچنے کے لئے سفر، یہ سفر جائز اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِنعام ہے کہ انسان جس جگہ دُشمنوں سے جسمانی اذیت کا خطرہ محسوس کرے وہاں سے نکل جائے، تاکہ اس خطرے سے نجات ہو، یہ چوتھی قسم کا سفر سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا، جبکہ قوم کی ایذاؤں سے نجات حاصل کرنے کے لئے عراق سے ملکِ شام کی طرف روانہ ہوئے، اور فرمایا: ''اِنِّیْ مُھَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ'' ان کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی ایک سفر مصر سے مدین کی طرف کیا: ''فَخَرَجَ مِنْھَا خَآئِفًا یَّتَرَقَّبُ''۔

پانچواں سفر آب وہوا کی خرابی اور امراض کے خطرے سے بچنے کے لئے ہے، شریعتِ اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چرواہوں کو مدینہ سے باہر جنگل میں قیام کرنے کا ارشاد فرمایا، کیونکہ شہری آب وہوا ان کو موافق نہ تھی، اسی

طرح حضرت فاروقِ اعظمؓ نے ابوعبیدہؓ کو حکم بھیجا تھا کہ دارالخلافہ اُردُن سے منتقل کر کے کسی سطح مرتفع پر لے جائیں، جہاں آب وہوا خراب نہ ہو۔

لیکن یہ اس وقت میں ہے جب کسی مقام پر طاعون یا وبائی امراض پھیلے ہوئے نہ ہوں، اور جس جگہ کوئی وبا پھیل جائے اس کے لئے حکم یہ ہے کہ جو لوگ اس جگہ پہلے سے موجود ہیں وہ تو وہاں سے بھاگیں نہیں اور جو باہر ہیں وہ اس کے اندر نہ جائیں، جیسا کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کو سفرِ شام کے وقت پیش آیا، کہ سرحد شام پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملکِ شام میں طاعون پھیلا ہوا ہے، تو آپ کو اس ملک میں داخل ہونے میں تردّد پیش آیا، صحابہ کرامؓ سے مسلسل مشوروں کے بعد آخر میں جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کو یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"اِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَّأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا مِنْهَا وَاِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَّلَسْتُمْ بِهَا فَلَا تَهْبِطُوْا عَلَيْهَا." (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

.....ترجمہ: "جب کسی خطے میں طاعون پھیل جائے اور تم وہاں موجود ہو تو اَب وہاں سے نہ نکلو، اور جہاں تم پہلے سے موجود نہیں وہاں طاعون پھیلنے کی خبر سنو تو اس میں داخل نہ ہو۔"

اس وقت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے حکمِ حدیث کی تعمیل کرتے ہوئے پورے قافلے کو لے کر واپسی کا اعلان کر دیا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حدیث شریف کے اس حکم میں ایک خاص حکمت یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس جگہ مقیم ہیں جہاں کوئی وبا پھیل چکی ہے، یہاں کے لوگوں میں وبائی جراثیم کا موجود ہونا ظنِ غالب ہے، وہ اگر یہاں سے بھاگیں گے تو جس میں یہ مادّہ سرایت کر چکا ہے وہ تو بچے گا نہیں، اور جہاں یہ جائے گا وہاں کے لوگ اس سے متاثر ہوں گے، اس لئے یہ حکیمانہ فیصلہ فرمایا۔

چھٹا سفر اپنے مال کی حفاظت کے لئے ہے، جب کوئی شخص کسی مقام میں چوروں،

ڈاکوؤں کا خطرہ محسوس کرتے تو وہاں سے منتقل ہوجائے، شریعتِ اسلام نے اس کی بھی اجازت دی ہے کیونکہ مسلمان کے مال کا بھی ایسا ہی احترام ہے جیسا اس کی جان کا ہے۔

یہ چھ قسمیں تو اس ترکِ وطن کی ہیں جو کسی چیز سے بھاگنے اور بچنے کے لئے کیا گیا ہو، اور جو سفر کسی چیز کی طلب وجستجو کے لئے کیا جائے اس کی نو قسمیں ہیں:

① .....سفرِ عبرت: یعنی دُنیا کی سیاحت وسفر اس کام کے لئے کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات اور قدرتِ کاملہ کا اور اقوامِ سابقہ کا مشاہدہ کرکے عبرت حاصل کرے، قرآنِ کریم نے ایسے سفر کی ترغیب دی ہے: "اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ"، حضرت ذی القرنین کے سفر کو بھی بعض علماء نے اسی قسم کا سفر قرار دیا ہے، اور بعض نے فرمایا کہ ان کا سفر زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرنے کے لئے تھا۔

② .....سفرِ حج: اس کا چند شرائط کے ساتھ فرضِ اسلامی ہونا سب کو معلوم ہے۔

③ .....سفرِ جہاد: اس کا فرض یا واجب یا مستحب ہونا بھی سب مسلمانوں کو معلوم ہے۔

④ .....سفرِ معاش: جب کسی شخص کو اپنے وطن میں ضرورت کے مطابق معاشی سامان حاصل نہ ہوسکے تو اس پر لازم ہے کہ یہاں سے سفر کرکے دُوسری جگہ تلاشِ روزگار کرے۔

⑤ .....سفرِ تجارت: یعنی قدرِ ضرورت سے زائد مال حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا، یہ بھی شرعاً جائز ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ" ابتغاءِ فضل سے مراد اس آیت میں تجارت ہے، اللہ تعالیٰ نے سفرِ حج میں بھی تجارت کی اجازت دے دی ہے، تو تجارت کے لئے ہی سفر کرنا بدرجۂ اَوْلیٰ جائز ہوا۔

⑥ .....طلبِ علم کے لئے سفر: اس کا بقدرِ ضرورتِ دِین فرضِ عین ہونا، اور زائد از ضرورت کا فرضِ کفایہ ہونا، معلوم ومعروف ہے۔

⑦ .....کسی مقام کو مقدس اور متبرک سمجھ کر اس کی طرف سفر کرنا: یہ بجز تین مسجدوں کے دُرست نہیں، مسجدِ حرام (مکہ مکرمہ)، مسجدِ نبوی (مدینہ طیبہ)، مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس)، (یہ قرطبی اور ابن عربی کی رائے ہے، دُوسرے اکابر علمائے سلف وخلف نے عام مقاماتِ

متبرکہ کی طرف سفر کرنے کو بھی جائز قرار دیا ہے، محمد شفیع)۔

⑦.....اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے سفر: جس کو ''رباط'' کہا جاتا ہے، احادیثِ کثیرہ میں اس کی بڑی فضیلت مذکور ہے۔

⑧.....عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کے لئے سفر: حدیث میں اس کو بھی باعثِ اجر وثواب قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں اقرباء واحباب کی ملاقات کے لئے سفر کرنے والے کے لئے فرشتوں کی دُعا کا ذکر فرمایا گیا ہے (یہ جب ہے کہ ان کی ملاقات سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو، کوئی مادّی غرض نہ ہو) واللہ اعلم۔ (قرطبی، ج:۵، ص:۳۴۹ تا ۳۵۱، سورۂ نساء)

لطیفہ ملیحہ.....مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ صاحبِ عقائد النسفیہ ابوحفص عمر، علامہ جاراللہ زمخشری سے مکہ مکرّمہ ملاقات کے لئے تشریف لے گئے، کیونکہ: ''بہار عمر ملاقات دوستاں باشد'' دروازے پر دستک دی، علامہ جاراللہ زمخشری نے اندر سے کہا کون؟ موصوف نے جواب دیا: عمر! زمخشری نے کہا: انصرف، منصرف ہوجا، یعنی واپس ہوجا، آپ نے فرمایا: عمر لا ینصرف، عمر منصرف نہیں ہوتا، زمخشری نے کہا: اذا انکر صرف، یعنی جب عمر خصوصیت نہیں رکھتا ایک عام آدمی ہے تو اس کو واپس جانا ہوگا اور ہم تجھ کو معرفہ یعنی اہلِ خصوصیت نہ بنائیں گے، لہٰذا خیریت سے واپس ہوجا۔ (حالاتِ مصنفین، ص:۲۳۷)

ترجمہ قرآن کے اِمام و بانی.....قرآنِ کریم عربی زبان میں اُترا جس کا ہندوستان کے عوام کو سمجھنا بہت مشکل تھا، اس لئے ہندوستان میں سب سے پہلے عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۱۵۰ھ میں کلام اللہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا جس کا نام ''فتح الرحمٰن'' رکھا، اُس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان بکثرت فارسی زبان سمجھتے تھے اور خط وکتابت اکثر وبیشتر فارسی میں ہوتی تھی اور سرکاری مراسلے سب کے فارسی ہی میں ہوتے تھے، اس لئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں کی سہولت کے لئے فارسی میں ترجمہ کیا، بعد ازاں فارسی کا رواج کم ہوتا چلا گیا اور ضرورت اس کی ہوئی کہ اُردو زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا جائے، چنانچہ شاہ ولی اللہؒ کے ترجمے کے پچپن سال بعد ۱۲۰۵ھ میں اُن کے فرزند

ارجمند شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اُردو زبان میں قرآنِ کریم کا بامحاورہ ترجمہ کیا، مگر اس کا پورا پورا لحاظ رکھا کہ محاورہ مدلولِ قرآنی کے تابع رہے، ایسا نہ ہو کہ مدلولِ قرآنی کو محاورۂ زبان پر قربان کر دیا جائے، یہ اُردو زبان میں سب سے پہلا ترجمہ تھا جو نہایت عمدہ ہے اور بے مثال اور بے نظیر ہے، اور ہر طرح سے قابلِ اطمینان اور قابلِ وثوق و اعتماد ہے، اور تمام علمائے ربانیین کے نزدیک مستند اور معتمد ہے، شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے علاوہ ترجمہ کے مختصر اور ضروری فوائد بھی لکھے ہیں، جو مشکلات میں مشعلِ راہ کا کام دیتے ہیں، اور جن مشکل مقامات میں اکابر علماء میں کا قلم خاموش نظر آتا ہے وہاں شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا قلم بولتا ہے اور بالبداہت اس شعر کا مصداق نظر آتا ہے۔

بنی اندر خود علوم اولیاء　　بے کتاب و بے معید و اوستا

اور اس ترجمے کا نام ''موضح القرآن'' رکھا جو اس کی صفت بھی ہے اور تاریخ بھی، شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۳۰ھ میں بمقام دہلی وفات پائی۔

دُوسرا اُردو ترجمہ شاہ عبدالقادر کے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۱۲۳۳ھ نے کیا، مگر شاہ رفیع الدین کا ترجمہ تحت اللفظ تھا، کہ جو ترتیب الفاظِ قرآنی کی ہے وہی ترتیب اُردو ترجمے کے الفاظ کی رہی، تاکہ کم استعداد والے کو یہ معلوم ہو سکے کہ یہ کس لفظ کا ترجمہ ہے، اس امر کو ملحوظ رکھ کر شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے لفظی ترجمہ فرمایا، اور یہ امر ایک درجے میں بہت مشکل ہے کہ اُردو ترجمے میں الفاظِ قرآنی کی ترتیب بھی ملحوظ رہے، اور تاحدِ اِمکان اُردو زبان کی فصاحت بھی ملحوظ رہے، الغرض اس مصلحت کی بناء پر شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ لفظی تھا اور شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ بامحاورہ تھا، تاکہ قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے اور مطلب بخوبی ذہن میں آجائے، اس لئے کہ جو سہولتِ فہم بامحاورہ ترجمے سے حاصل ہو سکتی ہے، وہ لفظی ترجمے سے حاصل نہیں ہو سکتی، اگرچہ تحت اللفظ ترجمہ کرنا اور ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا، یہ بھی بہت بڑا کمال ہے، لیکن آسانی سے مطلب سمجھنا جو بامحاورہ ترجمے سے ممکن ہے وہ تحت اللفظ ترجمے سے ممکن

نہیں، غرض یہ کہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے بامحاورہ ترجمہ کیا جو عجب شان رکھتا ہے کہ جس کے الفاظ فصاحت و بلاغت کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اس کے تحت معانی کا ایک سمندر موجزن ہے، کسی بزرگ کا قول ہے کہ اگر قرآن اُردو زبان میں نازل ہوتا تو وہ انہی محاورات اور الفاظ کے لباس میں نازل ہوتا جو شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے استعمال کئے ہیں۔ اسی عرصے میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے ۱۲۰۸ھ میں فارسی زبان میں ایک مبسوط تفسیر لکھنی شروع کی جو حقائق و معارف میں بلاشبہ امام رازیؒ کی تفسیر کبیر کا نمونہ تھی، کاش! کہ مکمل ہو جاتی، مگر افسوس کہ مکمل نہ ہو سکی، ایک حصے میں صرف پارۂ الم اور پارۂ سیقول کی آیت "وان تصوموا خیر لکم" تک تفسیر آئی، اور دُوسرے حصے میں پارہ تبارک الذی اور پارہ عم کی تفسیر آئی، درمیان قرآن کی تفسیر نہ ہو سکی، اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو بسیط ارض پر اس تفسیر کی نظیر نہ ہوتی، جیسا کہ تفسیر عزیزی موجودہ حصہ دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے دقیق اور عمیق علوم کسی اور تفسیر میں نظر نہیں آتے۔

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی، نمازِ جنازہ بیرون شہر دہلی ادا کی گئی، اطراف و اکناف سے آنے والوں کے ہجوم کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا، پچپن مرتبہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی، اور دہلی کے ترکمان دروازے کے باہر اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

غرض یہ کہ ہندوستان میں فارسی اور اُردو میں ترجمہ اور تفسیر لکھنے کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ کے وقت سے شروع ہوا، شاہ ولی اللہؒ ۱۱۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۵۰ھ میں فارسی قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا، جس کا نام "فتح الرحمٰن" رکھا، اور ۱۱۶۷ھ میں وفات پائی، مقتدائے دقیقہ شناس تاریخ وفات ہے۔

تفسیر قرآن کا پہلا بنیادی پتھر اس کا وہ صحیح ترجمہ ہے جو قواعدِ عربیت اور قواعدِ شریعت کے پورا پورا مطابق ہو، ہندوستان میں تفسیر قرآن کا یہ سنگِ بنیاد یعنی صحیح ترجمہ قرآن شاہ ولی اللہؒ اور ان کے دونوں بیٹوں شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے ہاتھوں رکھا گیا اور

ہندوستان میں یہ خیرِ کثیر (ترجمہ قرآنِ کریم) اس مبارک باپ اور مبارک بیٹوں کے ہاتھوں سے جاری ہوئی اور یہی تین ترجمے اُردو زبان میں تفسیر قرآن کے لئے سنگِ بنیاد بنے، اور ہندوستان میں کوئی عالم ان ترجموں سے بہتر ترجمہ نہ کرسکا، جزاھم اللہ تعالٰی بہ عن الاسلام وسائر المسلمین خیرًا، آمین یا رَبّ العالمین!

غرض یہ کہ یہ حضرات ترجمہ قرآن کے بانی اور اِمام ہیں، اور علومِ دِینیہ میں تمام ہندوستان کے اُستاد ہیں، اور حق تو یہ ہے کہ اگر یہ تین ترجمے نہ ہوتے تو ہر کس وناکس کو ترجمے کا حوصلہ بھی نہ ہوتا، اس لئے کہ کسی کے کلام اور مطلب کو ایک زبان سے دُوسری زبان میں ادا کرنے کا نام ترجمہ ہے، اور یہ کام نہایت دُشوار ہے، جب تک مترجم دونوں زبان کے لغات اور محاورات اور استعارات وکنایات اور حقیقت ومجاز اور اسالیبِ کلام سے پورا واقف نہ ہو تو ترجمہ نہیں کرسکتا، ہر کس وناکس کا تو کیا ذکر ہے، اگر ان حضرات کے یہ تراجم نہ ہوتے تو بڑے بڑے علماء کو ترجمہ دُشوار ہوجاتا اور شاید بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعے کے بعد بھی ایسا ترجمہ نہ کرسکتے، ان حضرات جیسا نورِ فہم اور نورِ تقویٰ کس کے پاس ہے؟ جو ان جیسا ترجمہ کرسکے۔ ان تین ترجموں کے بعد جس کسی نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا، سو اس نے شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے بیٹوں کے ترجموں کی مدد اور سہارے سے کیا، حق جل شانہ نے اپنے کلام پاک کی اس خدمت یعنی ترجمے کے لئے سرزمین ہند سے شاہ ولی اللہؒ اور اس کے بیٹوں کو منتخب فرمایا، وَذٰلِکَ فَضْلُ اللہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ۔

بحمدہٖ تعالیٰ جب فہمِ قرآن کی یہ پہلی منزل یعنی ترجمے کی منزل گزر گئی اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ان تین علمائے ربانیین اور راسخین فی العلم کے تین نہایت صحیح اور بے مثال ترجمے پہنچ گئے تو اَب اس منزل کے طے ہوجانے کے بعد ضرورت اس کی تھی کہ اُردو زبان میں قرآنِ کریم کی کوئی مختصر اور جامع تفسیر لکھی جائے، جس میں فقط حل مطالب اور ربطِ آیات کا خاص اہتمام کیا جائے، اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی طرح اقوالِ مختلفہ میں سے اَرجح الاقوال پر اکتفاء اور اقتصار کیا جائے اور لطائف اور نکات اور مذاہب باطلہ کی تردید کی تفصیل

سے گریز کیا جائے، تا کہ خاص وعام اس سے نفع اُٹھا سکیں۔

یہ خدمت اور سعادت من جانب اللہ حکیم الامت حضرت مولانا حافظ محمد اشرف علی صاحب تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ قدس اللہ سرہٗ کے حصے میں آئی اور ''بیان القرآن'' کے نام سے ۱۳۲۵ھ میں ایک تفسیر لکھی جو اپنی افادیت اور جامعیت اور مقبولیت میں ثریٰ سے ثریا تک پہنچ گئی۔

اور اسی زمانے میں ''بیان القرآن'' سے کچھ عرصہ پہلے حضرت مولانا عبدالحق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتح المنان'' کے نام سے ایک تفسیر لکھی جو تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے، جس میں مختصر حل قرآن وتوضیح مطالب کے علاوہ یہود اور نصاریٰ اور ملاحدہ اور زنادقہ کی تردید پر بھی کلام فرمایا اور فلسفۂ قدیم وجدید کے اعتراضات کے تسلی بخش جوابات دیئے، یہ تفسیر بھی بحمدہٖ تعالیٰ بہت مقبول ہوئی اور گم گشتگانِ راہ کے لئے مشعلِ ہدایت بنی، مگر تفسیری حیثیت سے، مطالبِ قرآنیہ کی بالاستیعاب توضیح اور مسلسل تشریح اور ربطِ آیات اور حل مشکلات اور بیان معانی میں جو نرالی شان ''بیان القرآن'' کو حاصل ہوئی وہ اُردو زبان میں کسی اور تفسیر کو حاصل نہیں ہوئی، **واللہ یختص برحمتہ من یشاء۔**

اور اسی طرز پر ایک نہایت مختصر اور جامع تفسیر جو جدید شبہات کے قلع قمع کے لئے کافی اور شافی ہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی قدس اللہ سرہٗ نے لکھی جو نہایت مقبول ہوئی، اور فصاحت وبلاغت اور حسنِ تعبیر کے اعتبار سے بھی بے نظیر ہے۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ..... حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں بعض اوقات ظرافت کی باتیں بھی ہو جاتی تھیں۔

ایک دفعہ فرمایا کہ ایک مغفل کھجور کے درخت پر چڑھ کر کھجوریں توڑنے لگا، جب اُترنے لگا تو طریقہ بھول گیا، ایک اور مغفل بھی آ گیا، اس نے رسہ طویل نیچے سے اس کی طرف پھینکا کہ اس کو اپنے بدن کے ساتھ باندھ لے، میں تجھے نیچے کھینچ لوں گا، نیچے کھینچا تو بیچارہ گر کر مر گیا، لوگوں نے اس کو پکڑا، یہ تو نے کیا کیا، بے چارے کی جان بھی گئی، جواب دیا کہ: میں نے ایک دفعہ ایک شخص کو کنویں سے اسی طریقے سے اُوپر کھینچ لیا تھا، اسی پر قیاس

کر کے میں نے سمجھا۔

چہ دہ گز بہ بالا چہ دہ گز بزیر

فرمایا: حضرت علامہ ابن جریر طبریؒ درسِ حدیث دے رہے تھے، کوئی رئیس آیا اور حضرت کی خدمت میں اشرفیوں کی تھیلی پیش کی، اور رکھ کر جانے لگا، ابن جریر رحمہ اللہ نے اُٹھا کر تھیلی کو پھینک دیا، تھیلی پھٹ کر دینار اِدھر اُدھر بکھر گئے اور رئیس ان کے پیچھے دوڑنے لگا اور جمع کرنے لگا، حضرت ابن جریرؒ فرمانے لگے: جب تو نے یہ اشرفیاں مجھے دے دی تھیں تو اَب تم کس لئے جمع کرتے ہو؟ اب تو تمہاری ملک رہی نہیں۔ سچ ہے دُنیا کی حرص بُری چیز ہے۔

فرمایا: ایک دفعہ میں اور مولانا اصغر حسین صاحب مدرسہ دیوبند کے لئے چندے کی غرض سے سورت گئے، میزبان نے کچھ کھانا لاکر رکھا، ہم کھانے لگے، میں نے خیال کیا کہ اور تو شاید آئے گا نہیں، اسی میں گزارا کرلیا، تھوڑی دیر میں اور کھانا بھی لے آئے، مولانا اصغر حسین صاحب فرمانے لگے کہ: تو کیوں نہیں کھاتا؟ میں نے کہا: مجھے تو یاس کلی ہو چکی تھی، اب کھانا اور نہیں آئے گا، لہٰذا میں نے اسی میں گزارا کرلیا، اس ''یاس کلی'' پر بہت مسکراتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: اِمام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صاحب کو تعزیت نامہ لکھ کر بھیجا:

انا نعزیک لا ان علی ثقة من البقاء ولٰکن سنة الدین

فلا المعزی باق بعد میة ولا المعزی ان عاشا الیٰ احین

ترجمہ: ''ہم آپ کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور ہماری زندگی کا کچھ اعتبار نہیں، لیکن یہ سنت ہے دِین کی، پس نہ تو معزی باقی رہے گا اپنی میّت کے بعد، نہ تعزیت کرنے والا، اگرچہ ایک زمانے تک جیتے رہیں (آخر سب کو موت ہے)۔''

جب قضا ٹھہری تو پھر کیا سو برس یا ایک دن

(محمد غفرلہٗ)

تخلیق عالم اور عیدِ الٰہی..... تخلیق عالم اور عیدِ الٰہی کی اس آیت کے بارے میں بعض محققین سخت تردّد میں پڑ گئے، جس کا معنی یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے تخلیق ارض وسماوات کی مدت ستۃ ایام چھ روز قرار دی ہے، اور صحاح کی بعض روایات میں ہے کہ خدائے قدوس نے حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے روز پیدا کیا، پس اگر تخلیق عالم کی ابتدا ہفتہ کے روز سے مانی جائے تو پھر پورا ہفتہ تخلیق ہی کو محیط ہو جاتا ہے، اور تعطیل (استواء علی العرش) کے لئے کوئی دن باقی نہیں رہتا، لہٰذا کوئی صورت ایسی سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کے روز مان کر ستۃ ایام کو صحیح باقی رکھا جا سکے اور استواء کے لئے ایک روز فاضل نکالا جا سکے۔ اس اِشکال کے پیدا ہو جانے کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان محدثین و محققین نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی حدیث میں جو جمعہ کا دن ہے اس کو اپنے خیال میں اس سلسلے میں منسلک سمجھ لیا ہے جس میں کہ تخلیق ارض وسماوات ہوئی ہے، حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق اگرچہ جمعہ کے روز ہی ہوئی ہے، لیکن یہ جمعہ وہ جمعہ نہ تھا جو ستۃ ایام کے تذکرے کے بعد آتا تھا، بلکہ ایک عرصۂ مدیدہ کے بعد حق تعالیٰ نے کسی ایک جمعہ میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، اور تخلیق ارض وسماوات کے متصل جو جمعہ آتا تھا وہی درحقیقت استواء علی العرش اور عیدِ الٰہی کا روز ہے، ان حضرات کی نظر احادیث کے ذخیرے کی طرف کافی اور دقیق ہے، ان کے لئے ہماری یہ توجیہ اصل حقیقت کی نقاب کشائی کے لئے کافی ووافی ہے۔

عجیب واقعہ..... حافظ ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''طبقات الحنابلہ'' میں قاضی ابوبکر بن محمد بن عبدالباقی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے: ''میں ایک زمانے میں مکہ مکرمہ آ کر پڑ گیا تھا، ان دنوں ایک مرتبہ بہت ہی سخت بھوگ لگی، پاس کچھ تھا نہیں جس سے بھوک مٹاتا، اتفاق سے ایک ریشم کی تھیلی پڑی ہوئی مل گئی جس کا پھندنا بھی ریشم کی ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ میں اسے اُٹھا کر گھر لے آیا، اسے کھول کر دیکھا تو اس میں موتیوں کا ایسا نفیس وقیمتی ہار تھا کہ میں نے آج تک اس جیسا نہیں دیکھا تھا، میں باہر نکلا تو دیکھا ایک بوڑھا آدمی اسی کا اعلان کر رہا ہے، اس کے پاس ایک پھٹے پُرانے کپڑے میں پانچ سو دینار تھے اور

وہ یہ آواز لگا رہا تھا: ''موتیوں کی تھیلی واپس کرنے والے کو یہ رقم انعام میں دی جائے گی'' میں نے دِل میں کہا: میں ضرورت منداور بھوکا ہوں، کیوں نہ ان اشرفیوں کو لے کر کام میں لاؤں اوراس کو تھیلی واپس کر دُوں۔

میں نے اس سے کہا: میرے پاس آیئے، میں اس کو لے کر گھر پہنچا تو اس نے ہر چیز کی نشانی بتائی، تھیلی کیسی ہے؟ پھندنا کیسا ہے؟ موتی کس طرح کے ہیں اور کتنے ہیں؟ اور یہ کہ جس دھاگے سے باندھا گیا ہے وہ کیسا ہے؟ علامت صحیح پا کر میں نے تھیلی اسے دے دی، اس نے پانچ سو دینار میرے آگے کر دیئے، مگر اس وقت میری عجیب حالت ہوئی، میں نے لینے سے انکار کر دیا، میں نے کہا: یہ میرا فرض تھا کہ میں آپ کو لوٹاؤں، میں اس پر کوئی بدلہ نہیں چاہتا! اس نے کہا یہ آپ کو لینے پڑیں گے، اور بہت ہی اصرار کیا، لیکن میں تیار نہیں ہوا، آخر وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ادھر میرا قصہ یہ ہوا کہ میں مجبور ہو کر مکہ سے نکلا اور بحری سفر شروع کر دیا، اتفاق سے راستے میں کشتی ٹوٹ گئی اور مسافر ڈُوب گئے اور ان کا سامان ضائع ہو گیا، تنہا ایک میں تھا جو کشتی کے ایک ٹکڑے پر زندہ بچا رہا۔ عرصہ تک سمندر میں تیرتا رہا، مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ خدا خدا کر کے ایک جزیرے میں پہنچا، جہاں کچھ لوگ آباد تھے، میں ایک مسجد میں جا کر بیٹھ گیا، انہوں نے مجھے قرآن پاک پڑھتے دیکھا تو جزیرے کا کوئی شخص ایسا نہ بچا جس نے میرے پاس آ کر یہ نہ کہا ہو کہ: ''آپ ہمیں قرآن پاک پڑھا دیجئے'' اس طرح مجھے ان لوگوں سے ڈھیروں مال حاصل ہوا۔

کچھ دن بعد میں نے اس مسجد میں قرآن پاک کے چند بوسیدہ اوراق رکھے ہوئے دیکھے، میں انہیں اُٹھا کر پڑھنے لگا، انہوں نے پوچھا: ''آپ خوشنویسی بھی جانتے ہیں؟'' میں نے کہا: جی ہاں! انہوں نے کہا: ''آپ ہمیں لکھنا سکھا دیجئے'' غرض وہ اپنے بچوں اور جوانوں کو لے کر آ گئے اور میں انہیں سکھانے لگا، اس سے بھی مجھے کافی مال واسباب حاصل ہوا۔

ایک دن وہاں کے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ہمارے یہاں ایک یتیم بچی ہے اور اس کے پاس مال ومتاع بھی کافی موجود ہے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس سے شادی کر لیں، میں نے

منع کر دیا، لیکن وہ میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے ان کی بات ماننا پڑی۔ جب شبِ زفاف میں اسے لے کر میرے پاس آئے تو میں نظر اُٹھا کر اسے دیکھنے لگا، میں نے اس کی گردن میں بعینہٖ وہی ہار لٹکا ہوا دیکھا تو بھونچکا رہ گیا، اب میں صرف اس ہار کو دیکھ رہا تھا، لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو کہا: ''جناب! آپ نے اس یتیم بچی کا دِل توڑ دیا، آپ اسے دیکھنے کے بجائے ہار دیکھ رہے ہیں۔''

میں نے انہیں ہار کا قصہ سنایا، تو سب نے ایک ساتھ نعرہ لگایا اور اتنی زور سے ''اللہ اکبر'' کہا کہ تمام جزیرے والوں تک وہ آواز پہنچی۔ میں نے کہا: کیا ہوا؟ انہوں نے کہا: جن بڑے میاں نے تم سے ہار لیا تھا وہ اسی بچی کے باپ تھے، وہ کہا کرتے تھے: مجھے دُنیا میں صرف ایک سچا اور پکا مسلمان ملا، اور وہ وہ تھا جس نے مجھے ہار لوٹایا۔ وہ خدا سے دُعا کرتے تھے: ''خدایا! مجھے اس سے پھر ملا دے تا کہ میں اسے اپنی بیٹی بیاہ دُوں'' اور اب وہ آپ کو مل گئی۔

میں ایک مدت تک اس کے ساتھ رہا، اللہ نے مجھے اس سے دو بیٹے بھی دیئے، پھر اس کا انتقال ہو گیا اور ہار کا وارث میں اور میرے دونوں لڑکے ہوئے۔ کچھ دنوں بعد بچے بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور ہار تنہا میرے قبضے میں آیا۔ میں نے اسے ایک لاکھ دینار میں فروخت کیا، اور یہ جو مال و متاع تم کو نظر آ رہا ہے یہ سب اسی رقم کا باقی ماندہ حصہ ہے۔

قاضی ایاس کی ذہانت..... ایک آدمی نے حکومت کے بڑے عہدیدار کے پاس ایک تھیلی بطور امانت رکھوائی اور بتایا کہ یہ دیناروں سے بھری ہوئی ہے، اور خود ایک طویل مدت تک غائب رہا۔ جب امانت رکھوانے والا شخص طویل عرصہ اس اعلیٰ افسر کے پاس نہ آیا تو اس نے ایک چال چلی، وہ یہ کہ اس نے تھیلی کے نچلے حصے سے نہایت احتیاط کے ساتھ ڈوری کاٹ دی اور اس میں سے سارے دینار نکال کر اس کی جگہ درہم رکھ دیئے، پھر تھیلی کو اسی طرح سی دیا جیسی پہلے تھی۔ صاحبِ مال پندرہ سال کے بعد اس اعلیٰ افسر کے پاس آیا اور اس نے بطور امانت رکھوائی ہوئی اپنی تھیلی طلب کی۔ افسر نے صاحبِ مال کو اس کی تھیلی واپس کر دی جو اسی طرح سر بمہر تھی جس طرح کہ اس نے پندرہ سال قبل امانت رکھوائی تھی۔

جب صاحبِ مال نے تھیلی کھولی تو اس میں دینار کے بجائے درہم تھے، وہ یہ دیکھ کر جھنجھلا اُٹھا اور بولا: یہ تھیلی میری نہیں ہے، میری تھیلی میں دینار تھے جبکہ اس میں درہم ہیں، مجھے اپنی دیناروں والی تھیلی چاہئے۔

عہدیدار نے کہا: بھئی! غور سے دیکھو، تھیلی وہی ہے جو تم نے میرے پاس رکھوائی تھی، آج تک یہ سربند ہے، یہی تھیلی تمہاری ہے، میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا ہے۔ ادھر وہ شخص اس سے اصرار کرتا رہا کہ مجھے دینار چاہئیں، میری تھیلی وہ ہے جس میں دینار تھے۔ جب بات نہیں بنی تو صاحبِ مال نے اس وقت کے امیر عمر بن ہبیرہ کے پاس مقدمہ دائر کر دیا، عمر بن ہبیرہ نے قاضی ایاس بن معاویہ کے پاس یہ مقدمہ بھیج دیا۔

قاضی ایاس نے صاحبِ مال سے پوچھا: نوعیتِ مقدمہ بیان کرو!

صاحبِ مال نے عرض کیا: میں نے اس عہدیدار کے پاس دیناروں کی تھیلی بطور امانت رکھوائی تھی، مگر یہ مجھے درہموں کی تھیلی دے رہا ہے۔ قاضی ایاس نے پوچھا: کتنا عرصہ پہلے؟ صاحبِ مال نے جواب دیا: پندرہ سال قبل۔

اب قاضی ایاس عہدیدار کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا: تم کیا کہتے ہو؟

عہدیدار نے کہا: اس کی تھیلی سربمہر رکھی ہوئی ہے۔ قاضی ایاس نے پوچھا: کتنے برسوں سے؟ عہدیدار نے بتایا: پندرہ برسوں سے۔

قاضی ایاس نے خادموں کو حکم دیا کہ اس تھیلی کا بندھن کھول کر اس کے دراہم بکھیر دو۔

بکھرے ہوئے دراہم میں کچھ تو دس سال پُرانے سکے تھے اور کچھ پانچ سال پُرانے، اور کچھ اس کے آگے پیچھے برسوں کے سکے تھے۔ قاضی ایاس عہدیدار سے مخاطب ہوئے: تم نے اقرار کیا ہے کہ یہ تھیلی تمہارے پاس پندرہ سال سے تھی اور اس تھیلی کے اندر دس پانچ سال پُرانے سکے بھی ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تھیلی اس پندرہ سالہ مدت میں کبھی کھلی ضرور ہے اور اس وقت دیناروں کو دراہم سے بدلا گیا ہے۔

قاضی ایاس کی دلیل نے مجرم کو اقرارِ جرم پر مجبور کر دیا اور بالآخر عہدیدار نے اپنی غلطی کا

اعتراف کیا۔ یوں وہ مجرم کے زُمرے میں شامل ہوااور اس کی خیانت کی قلعی کھل گئی۔ (تاریخ دمشق الکبیر (۱۰/۲۲) ابن عساکر، داراحیاء التراث العربی)

دُور اندیشی..... علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ (یہ اِمام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن الجوزی ہیں، آپ کی ولادت ۵۱۰ھ میں بغداد میں ہوئی اور وہیں ۵۹۷ھ میں وفات پائی۔ آپ کی پرورِش و پرداخت حالتِ یتیمی میں چچی کے زیرِ تربیت ہوئی، اور اپنے ماموں شیخ ابوالفضل بن عامر سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ آپ علم کے شیدائی تھے، علومِ اسلامیہ میں اچھی طرح دسترس کے بعد وعظ و نصیحت کی مجلسیں قائم کیں اور درسِ حدیث میں تشنگانِ علومِ نبویہ کا مرکز بن گئے۔ چنانچہ آپ کی شہرت کا ڈنکا چہار سو بجنے لگا اور آپ ''حافظ'' کے لقب سے ملقب ہوئے) ''کتاب الاذکیاء'' میں لکھتے ہیں:

دو آدمی ایک قریشی خاتون کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے پاس سو دینار بطور امانت رکھ کر کہا: ''جب تک ہم دونوں اکٹھے ہو کر اپنا مال طلب نہ کریں، تب تک آپ یہ امانت واپس نہیں کریں گی، ہم دونوں کی موجودگی امانت واپس کرتے وقت ضروری ہے۔'' اس عورت نے ان کی امانت رکھ لی اور اس پر ایک سال کا وقفہ گزر گیا۔ ایک سال کے بعد ان دونوں میں سے ایک شخص اس خاتون کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ: میرے دُوسرے ساتھی کا انتقال ہو گیا ہے، اس لئے جو سو دینار ہم نے تمہارے پاس امانت رکھے ہیں، مجھے دے دو۔ خاتون نے امانت اس کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور کہنے لگی: تم دونوں ساتھیوں نے میرے پاس امانت رکھتے ہوئے یہ شرط رکھی تھی کہ میں تم میں سے ایک کی غیر موجودگی میں مال دُوسرے کے حوالے نہ کروں، اس لئے میں امانت تیرے سپرد نہیں کر سکتی۔ اس آدمی نے خاتون کے اہلِ خانہ اور اس کے پڑوسیوں سے مدد طلب کی، ان لوگوں نے اس خاتون سے سفارش کی کہ اس کو امانت دے دو کیونکہ اس کے ساتھ کا انتقال ہو گیا ہے۔ لوگوں کے بے حد اصرار اور سفارش پر اس عورت نے امانت اس شخص کو دے دی۔ ادھی اس بات کو ایک سال اور گزر گیا تو دُوسرا شخص جس کو اس کے دوست نے مرا ہوا ظاہر کیا تھا، اس عورت کے پاس آیا اور

آ کر امانت طلب کی، خاتون نے بتایا: تمہارا دُوسرا ساتھی آیا تھا اور اس نے بتایا کہ تمہاری وفات ہو چکی ہے، اس لئے میں نے امانت اس کے حوالے کر دی۔

وہ شخص عورت سے جھگڑنے لگا اور کہا کہ: میں تو زندہ سلامت ہوں، میری امانت واپس کرو۔ عورت نے کہا کہ: میں تو رقم تمہارے ساتھی کو دے چکی۔ اب اس نے عورت کے خلاف مقدمہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت میں پیش کر دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دونوں کا مقدمہ سنا، کچھ سوچا اور فرمایا کہ: اس مقدمے کو ہم علی بن ابی طالب کے سپرد کرتے ہیں اور ایک روایت کے مطابق خود ہی دونوں کو لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دونوں کے بیانات سنے اور معاملے کو بھانپ گئے کہ اس عورت کے ساتھ دھوکا ہوا ہے، چنانچہ فرمایا: ''کیا تم نے اس خاتون سے یہ شرط نہیں رکھی تھی کہ مال ایک کی غیر موجودگی میں دُوسرے کے حوالے مت کرنا؟'' اس آدمی نے جواب دیا: ''ہاں! یہ شرط تو رکھی گئی تھی'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہارا مال ہمارے پاس موجود ہے، اپنے ساتھی کو بلا لاؤ تا کہ میں تم دونوں کا مال تمہارے سپرد کر دُوں۔'' (کتاب الاذکیاء، ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ)

اِمامِ اعظم رحمہ للہ کی نصیحتیں..... حضرت اِمامِ اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اسمِ گرامی سے کون واقف نہیں، آپ رحمہ اللہ بڑے اُولوالعزم بزرگ، بیدار مغز، حاضر جواب، متقی، پرہیز گار اور صاحبِ علم و عمل رہنما تھے۔ اب آپ کی خدمتِ اقدس میں حضرت اِمامِ اعظم رحمہ اللہ کی کچھ نصیحتیں اور وصیتیں پیش کرتا ہوں جو انہوں نے اپنے شاگردِ رشید یوسف بن خالد سمتی بصری کو کی تھیں۔ یہ نصیحتیں اور وصیتیں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

حضرت یوسف بن خالد سمتی بصری نے جب اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے علم حاصل کیا اور اپنے شہر بصرہ کو واپسی کا ارادہ کیا تو اِمامِ اعظم رحمہ اللہ سے اجازت چاہی، حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ:

جانے میں جلدی نہ کرو، کچھ تو انتظار کرو یہاں تک کہ تم کو ایسی وصیت کروں جس کی تم کو

لوگوں سے ملاقات رکھنے، اہل علم کے مرتبے کو پہچاننے، اپنے نفس کو آدابِ زندگی پر ڈالنے، ماتحتوں سے مناسب طریقے سے برتاؤ کرنے، خاص وعام کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھنے اور لوگوں کے حالات سے باخبر رہنے میں ضرورت پڑے گی۔ میری وصیت کو لے کر جب تم باہر نکلو گے تو تمہارے ساتھ اس نصیحت کا ایک آلہ ہوگا جس کی علم کو بہت ہی ضرورت ہے، اور وہ علم کو چار چاند لگائے گا اور اسے عیب دار ہونے سے محفوظ رکھے گا۔''

اس کے بعد فرمایا: ''صبر کرو یہاں تک کہ میں تم کو تفصیلی وصیت کرنے کے لئے فرصت کا وقت نکال لوں اور اپنی فکر کو تمہاری طرف پوری لگا سکوں اور تم کو ایسی بات بتادوں جس کی وجہ سے تم اپنے دِل میں میرے شکر گزار رہو گے۔''

حضرت یوسف بن خالد فرماتے ہیں کہ: جب اتنا وقت گزر گیا جس کے گزر جانے پر وصیت کرنے کا وعدہ کیا تھا تو مجھ کو تنہائی میں وقت دیا اور فرمایا کہ: ''میں اب تم کو وہ تمام باتیں کھول کر تفصیل سے بتا دیتا ہوں جن کے لئے میں تمہارے واپس جانے میں مزاحم بنا، وہ منظر گویا میری آنکھوں کے سامنے ہے جبکہ تم بصرہ میں داخل ہو گے اور تمہارے مخالفین تمہاری طرف متوجہ ہوں گے اور اس وقت تم اپنے نفس کو (علم کے غرور میں) اُن کے مقابلے میں بلند کرو گے اور علم کے ذریعہ اُن کے سامنے بطور فخر بڑھ چڑھ کر بولنے والے بنو گے (جس کے نتیجے میں یہ ہوگا) تم اُن کے پاس اُٹھنے بیٹھنے اور ساتھ رہنے سے دِل برداشتہ ہو جاؤ گے، تم اُن کے مخالف ہو جاؤ گے اور وہ تمہارے مخالف ہو جائیں گے، اور پھر تم اُن سے تعلقات ختم کرو گے، اور پھر تم ان لوگوں سے خراب الفاظ میں بات کرو گے اور وہ تمہیں خراب لفظوں میں یاد کریں گے، تم اُن لوگوں کو گمراہ کہو گے اور وہ تمہارے راستے کو غلط بتائیں گے، وہ تم سب کو بدعت کی طرف منسوب کریں گے۔ ان تمام باتوں کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اور تم دونوں کی ذاتوں پر عیب لگایا جائے گا۔ آخر نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم لوگوں کو چھوڑ کر کسی اور مقام پر چلے جانے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی ایسے حالات پیدا کرے جن کی وجہ سے خاص وعام میں نہ رہ سکے، ہوشیاری اور عقل مندی کی بات یہ ہے کہ میل جول اور اچھے

تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرنی ہے، کیونکہ وہ عقل مند نہیں ہے جو ایسے شخص سے نبھانے کا خیال نہ رکھے جس کے ساتھ نبھانا ضروری ہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی راہ نکالے۔

جب تم بصرہ میں داخل ہوگے تو وہاں کے لوگ تمہارا خیر مقدم کریں گے اور تمہاری زیارت کو آئیں گے اور تمہارا حق پہچانیں گے، اس وقت تم ہر فرد کو اس کے مرتبے کے مطابق جگہ دینا، اور شریفوں کی عزت کرنا، اہل علم کی تعظیم کرنا، بوڑھوں کا ادب کرنا، نوعمروں اور نوجوانوں کے ساتھ لطف سے پیش آنا، عوام کے نزدیک ہونا، بدکرداروں کی مدارت کرنا، اچھے افراد کی صحبت اختیار کرنا، صاحبِ اقتدار بادشاہ قاضی وغیرہ سے (قول وعمل میں) اس طرح پیش آنا جس طرح وہ ایک معمولی فرد سمجھے جائیں، کسی کو کبھی حقیر مت سمجھنا، مروّت میں کوتاہی مت کرنا، اپنا بھید کسی پر ظاہر نہ ہونے دینا، کسی کی دوستی پر بغیر امتحان کے بھروسہ نہ کرنا، کسی کمینے اور خبیث شخص سے دوستی نہ کرنا اور اس شے سے اُلفت نہ رکھنا جو تمہارے ظاہر کو حال کے مطابق نہ سمجھتی ہو۔ بے وقوف دوستوں سے بے تکلفی نہ برتنا، صبر، خوش خلقی اور سینے کی کشادگی کو لازم کر لینا، نئے کپڑوں کو استعمال کرنا، اپنی ذاتی ضرورتوں کو تنہائی کا وقت نکال کر پورا کرنا، اپنے خادموں اور ماتحتوں کے معاملات کی ٹوہ میں لگے رہنا اور اس سلسلے میں تم ان کے ساتھ نرمی کے ساتھ پیش آتے رہنا، ڈانٹ ڈپٹ زیادہ نہ کرنا ورنہ بے اثر ہو جائیں گے (یعنی وہ ڈھیٹ ہو جائے گا)، اور ان کو اپنے ہاتھ سے سزا نہ دینا، اس سے تیرا وقار دیرپا رہے گا، اور اپنی نمازیں پابندی سے ادا کرتے رہنا، اور اپنے عزیز واقارب کی دعوتیں کرتے رہنا، کیونکہ ایک بخیل کبھی سرداری کے قابل نہیں ہوسکتا۔ تیرا ایک خاص مشیر کار بھی ہونا چاہئے جو لوگوں کے حالات سے تجھ کو باخبر کرتا رہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جب تجھے کسی گڑبڑ کی اطلاع ملے گی تو اس کو ٹھیک کرنے کے لئے جلدی کرے گا اور جب کسی کام کی خوبی کا پتا چلے گا تو اور زیادہ دِلچسپی سے اس کام کو انجام دے گا۔ جو تجھ سے ملاقات کرنے آئے اور جو نہ آئے تو ان دونوں قسم کے افراد کے ساتھ اچھا برتاؤ

کرنا، اوران سے ملاقات کرنے جانا اور جو شخص تجھ پر اچھا یا بُرا برتاؤ کرے تو اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آتے رہنا اور معاف کرتے رہنا، اور نیکیوں کا حکم دیتے رہنا، اور کبھی غافل نہ رہنا، جو تجھ کو تکلیف دے یا پریشان کرے اسے چھوڑ دینا، بدلہ لینے کی کوشش مت کرنا، جو ملاقاتی بیمار ہو جائے یا کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائے تو بذاتِ خود اس کی مزاج پرسی کرنے ضرور جانا اور اپنے قاصدوں کے ذریعے ان کے حالات کی خبر رکھنا، اور اگر کوئی شخص ملاقاتی آنا بند کر دے تو اس کے حالات کی تفتیش کرتے رہنا اور اگر کوئی شخص تیرے بارے میں خراب الفاظ نکالے یا گالی دے تو اس کے بارے میں اچھی باتیں کرنا۔ اگر کوئی شخص انتقال کر جائے (اور اگر اس کا حق تیرے ذمے ہو) تو اس کا حق اس کے وارثوں کو ادا کر دینا۔ جس کسی کے گھر میں کوئی خوشی ہو تو اس کو مبارک باد دینا، اور جو مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو اس کو تسلی دینا۔ اگر کوئی شخص اپنے کام کے لئے تجھ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو اس کے ساتھ جانے کے لئے کھڑے ہو جانا۔ جہاں تک ہو سکے لوگوں کے سامنے دوستی ظاہر کرنا، جب کسی دُوسرے کے ساتھ کسی محفل یا مجلس میں بیٹھے یا کسی مسجد میں لوگوں کے ساتھ تیری ملاقات ہو اور سوالات ہونے شروع ہو جائیں اور ان کے سوالات تیرے مسلک کے خلاف ہوں تو جلدی سے اپنی رائے کا اظہار مت کرو۔

لوگ جو کام تجھ سے نہ لیں، اس میں دخل اندازی مت کرنا۔ لوگوں کے لئے اس حالت پر تیار یا راضی ہو جانا جس پر وہ اپنے نفسوں کے ساتھ راضی ہوں۔ ان کی طرف سے اپنی نیت کو صاف رکھنا۔ سچائی کو ہمیشہ کام میں لانا اور غرور و تکبر ایک طرف پھینک دینا، کیونکہ اللہ تعالیٰ غرور و تکبر کو پسند نہیں کرتا اور کبھی کسی کو دھوکا یا فریب مت دینا، اگرچہ لوگ تجھ سے خیانت کا برتاؤ بھی کریں، اور اگر کسی سے کوئی عہدہ یا وعدہ کرو تو اس کو پورا کرنا اور پرہیز گاری کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دینا، دُوسرے مذاہب والوں سے مناسب معاشرتی آداب کے ساتھ پیش آنا۔''

ان نصیحتوں کے بعد حضرت اِمام صاحب نے اپنے شاگرد عزیز سے فرمایا کہ: ''بے شک تو اگر میری ان نصیحتوں کو مضبوطی سے پکڑے گا تو میں اُمید کرتا ہوں کہ (تو سب خرابیوں

اور مصیبتوں سے) محفوظ رہے گا۔''

اس کے بعد فرمایا کہ: ''مجھ کو تیری جدائی سے رنج وغم ہے، اور تجھ سے جو جان پہچان ہے، وہ میرے لئے اُنس کا ذریعہ ہے، تو اپنے خطوط کے ذریعے مجھ سے تعلق باقی رکھنا اور اپنی ضروریات و حاجات سے مطلع کرتے رہنا، اور اس بارے میں تو میرے لئے ایک بیٹے کی مانند ہے اور میں باپ کی طرح ہوں۔'' (حربِ مؤمن)

سچ کی تاثیر..... ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر خدمت ہوا، اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھ میں چار بُرائیاں پائی جاتی ہیں، ایک یہ کہ بدکار ہوں، دُوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں، تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں اور چوتھی بُرائی مجھ میں یہ ہے کہ جھوٹ بولتا ہوں۔ ان میں سے آپ فرمائیں کہ کون سی بُرائی ترک کردُوں؟ اب چاروں گناہ اس نوعیت کے تھے کہ کسی کے لئے بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس گناہ کو جاری رکھو، لیکن نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اب ایسا پُرحکمت جواب عطا فرمایا کہ تمام بُرائیوں سے چھٹکارا مل گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جھوٹ نہ بولا کرو۔ یہ بظاہر دیکھنے میں تو چاروں گناہوں میں سے ایک کم تر بُرائی تھی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی حقیقت جانتے تھے اور سچ کی تاثیر سے واقف تھے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُوسرے تمام گناہوں پر اسے ترجیح دی، چنانچہ اس شخص نے عہد کیا کہ میں اس بات پر قائم رہوں گا اور آئندہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جب رات ہوئی تو اس کے دِل نے حسبِ عادت شراب پینے کی خواہش ظاہر کی، پھر بدکاری کا خیال آیا، مگر پھر اسے خیال گزرا کہ اگر صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھ لیا کہ رات کو شراب پی تھی یا بدکاری کی تھی؟ تو کیا جواب دُوں گا؟ اگر اقرار کروں گا تو شراب پینے اور زنا کی سزا دی جائے گی، اور اگر انکار کردیا تو یہ عہد کے خلاف ہوگا اور میں جھوٹ بولوں گا، جس کو ترک کرنے کا وعدہ کرچکا ہوں۔ یہ سوچ کر اس رات ان دونوں گناہوں سے باز رہا۔ پھر رات گئے چوری کا خیال آیا تو پھر یہی فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوری کی بابت سوال کرلیا تو کیا جواب دُوں گا؟ اگر جواب اثبات میں ہوا تو چوری کی حد نافذ ہوگی اور

اگر اپنے جرم سے مکر گیا تو یہ عہد کے خلاف ہوگا، نتیجتاً اس گناہ سے بھی باز رہا۔ صبح کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں جھوٹ نہ بولنے کی وجہ سے اپنی بقیہ دیگر بدعادت سے بھی چھٹکارا پا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر خوش ہوئے۔ (سیرت النبی، شبلی نعمانی، ج:۶، ص:۱۷۸)

خون آمیز خط..... غازی انور پاشا ترکی کے ان جلیل القدر مجاہدین میں سے تھے جنھوں نے اپنی ساری عمر اسلام دُشمنوں کے ساتھ جہاد میں صَرف کی اور بالآخر رُوسی بالشویکوں سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ انہوں نے اپنی شہادت سے صرف ایک دن پہلے ایک خط اپنی بیوی شہزادی نجیہ سلطانیہ کے نام روانہ کیا تھا جو انہوں نے ترکی اخبارات میں شائع کرادیا اور وہیں سے ترجمہ ہوکر ۲۲ر اپریل ۱۹۲۳ء کے ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوا۔ یہ مکتوب اس قدر ولولہ انگیز اور سبق آموز ہے کہ ہر نوجوان کو پڑھنا چاہئے، ذیل میں اس کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔

میری رفیقۂ حیات اور سرمایۂ عیش وسرور پیاری نجیہ!

خدائے بزرگ و برتر تمہارا نگہبان ہے، تمہارا آخری خط اس وقت میرے سامنے ہے، یقین رکھو تمہارا یہ خط ہمیشہ میرے سینے سے لگا رہے گا۔ تمہاری صورت تو دیکھ نہیں سکتا، مگر خط کی سطروں اور حرفوں میں تمہاری اُنگلیاں حرکت کرتی نظر آرہی ہیں، جو کبھی میرے بالوں سے کھیلا کرتی تھیں۔ خیمے کے اس دُھندلکے میں کبھی کبھی تمہاری صورت بھی نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔

آہ! تم لکھتی ہو کہ میں تمہیں بھول بیٹھا ہوں اور تمہاری محبت کی کچھ پروا نہیں کی۔ تم کہتی ہو کہ میں تمہارا محبت بھرا دِل توڑ کر اس دور افتادہ مقام میں آگ اور خون سے کھیل رہا ہوں، اور ذرا پروا نہیں کرتا کہ ایک عورت میرے فراق میں رات بھر تارے گنتی رہتی ہے۔ تم کہتی ہو کہ مجھے جنگ سے محبت ہے اور تلوار سے عشق، لیکن یہ لکھتے وقت تم نے بالکل نہ سوچا کہ تمہارے یہ لفظ جو یقیناً سچی محبت نے لکھوائے ہیں، میرے دِل کا کس طرح خون کر ڈالیں گے۔ میں تمہیں کس طرح یقین دِلا سکتا ہوں کہ دُنیا میں مجھے تم سے زیادہ کوئی محبوب نہیں، تم ہی

میری تمام محبتوں کا منتہٰی ہو، میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی، لیکن ایک تم ہی ہو جس نے میرا دِل مجھ سے چھین لیا ہے۔

پھر میں تم سے جدا کیوں ہوں؟ راحتِ جان! یہ سوال تم بجا طور پر کر سکتی ہو۔ سنو! میں تم سے اس لئے جدا نہیں ہوں کہ مال و دولت کا طالب ہوں، اس لئے بھی جدا نہیں ہوں کہ اپنے لئے ایک تختِ شاہی قائم کر رہا ہوں، جیسا کہ میرے دُشمنوں نے مشہور کر رکھا ہے، میں تم سے صرف اس لئے جدا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرض مجھے یہاں کھینچ لایا ہے، جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی فرض نہیں، یہی وہ فرض ہے جس کی ادائیگی کی نیت ہی انسان کو فردوسِ بریں کا مستحق بنا دیتی ہے، الحمدللہ! کہ میں اس فرض کی محض نیت ہی نہیں رکھتا بلکہ اسے عملاً انجام دے رہا ہوں۔ تمہاری جدائی ہر وقت میرے دِل پر آرے چلایا کرتی ہے، لیکن میں اس جدائی سے بے حد خوش ہوں، کیونکہ تمہاری محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جو میرے عزم وارادے کے لئے سب سے بڑی آزمائش ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میں اس آزمائش میں پورا اُترا اور اللہ کی محبت اور حکم کو اپنی محبت اور نفس پر مقدم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ تمہیں بھی خوش ہونا اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ تمہارا شوہر اتنا مضبوط ایمان رکھتا ہے کہ خود تمہاری محبت کو بھی اللہ کی محبت پر قربان کر سکتا ہے۔

تم پر تلوار سے جہاد فرض نہیں، لیکن تم بھی فرضِ جہاد سے مستثنٰی نہیں ہو، کوئی مسلمان مرد ہو یا عورت، جہاد سے مستثنٰی نہیں ہے۔ تمہارا جہاد یہ ہے کہ تم بھی اپنے نفس و محبت پر محبتِ خدا کو مقدم رکھو، اپنے شوہر کے ساتھ حقیقی محبت کے رشتے کو اور بھی مضبوط کرو۔ دیکھو! یہ دُعا ہرگز نہ مانگنا کہ تمہارا شوہر میدانِ جہاد سے کسی طرح صحیح و سلامت تمہاری آغوشِ محبت میں واپس آ جائے۔ یہ دُعا خود غرضی کی دُعا ہو گی اور خدا کو پسند نہ آئے گی۔ البتہ یہ دُعا کرتی رہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے شوہر کا جہاد قبول فرمائے، اسے کامیابی کے ساتھ واپس لائے ورنہ جامِ شہادت اس کے لبوں سے لگائے، وہ لب جو تم جانتی ہو شراب سے کبھی ناپاک نہیں ہوئے، بلکہ ہمیشہ تلاوت ؛؛ الٰہی سے سرشار رہے ہیں۔ پیاری نجیہ! آہ وہ ساعت کیسی مبارک ہو گی جب

اللہ تعالیٰ کی راہ میں یہ سر، جسے تم خوبصورت بتایا کرتی تھیں، تن سے جدا ہوگا، وہ تن جو تمہاری محبت کی نگاہوں میں سپاہیوں کا نہیں، نازنینوں کا سا ہے۔ انور کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ شہید ہو جائے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس کا حشر ہو۔ دُنیا چند روزہ ہے، موت یقینی ہے، پھر موت سے ڈرنا کیسا؟

جب موت آنے ہی والی ہے تو پھر آدمی بستر پر پڑے پڑے کیوں مرے؟ شہادت کی موت، موت نہیں، زندگی ہے، لازوال زندگی!

نجیہ! میری وصیت سن لو! اگر میں شہید ہو جاؤں تو تم اپنے دیور نوری پاشا سے شادی کر لینا، تمہارے بعد مجھے سب سے زیادہ عزیز نوری ہے، میں چاہتا ہوں کہ میرے سفرِ آخرت کے بعد وہ زندگی بھر وفاداری سے تمہاری خدمت کرتا رہے۔ میری دُوسری وصیت یہ ہے کہ تمہاری جتنی بھی اولاد ہو سب کو میری زندگی کے حالات سنانا اور سب کو میدانِ جہاد میں اسلام و وطن کی خدمت کے لئے بھیج دینا، اگر تم نے یہ نہ کیا تو یاد رکھو! میں جنت میں تم سے رُوٹھ جاؤں گا۔

میری تیسری وصیت یہ ہے کہ مصطفیٰ کمال پاشا کی ہمیشہ خیر خواہ رہنا، ان کی ہر ممکن مدد کرتی رہنا، کیونکہ اس وقت وطن کی نجات خدا نے ان کے ہاتھ میں رکھ دی ہے۔ اچھا پیاری رُخصت! نہیں معلوم کیوں میرا دِل کہتا ہے کہ اس خط کے بعد تمہیں پھر کبھی خط نہ لکھ سکوں گا، کیا عجب ہے کہ ہی شہید ہو جاؤں۔ دیکھو! صبر کرنا، میری شہادت پر غم کھانے کے بجائے خوشی کرنا کہ میرا اللہ کی راہ میں کام آجانا تمہارے باعثِ فخر ہے۔

نجیہ! اب رُخصت ہوتا ہوں، اور اپنے عالم خیال میں تمہیں گلے لگاتا ہوں۔ اِن شاء اللہ جنت میں ملیں گے اور پھر کبھی جدا نہ ہوں گے۔ (تمہارا انور)

(یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ اس خط کے لکھنے کے وقت مصطفیٰ کمال پاشا صرف ایک مجاہد اسلام کی حیثیت سے معروف تھا، اور اس نے ترکی میں وہ اسلام دُشمن اقدامات نہیں کئے تھے جو بعد میں پیش آئے)

اللہ تعالیٰ کو ہنسانے والے کام..... حدیث میں ہے کہ چند باتیں ایسی ہیں کہ ان سے اللہ تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے، جیسی ہنسی اس کی شان کے مناسب ہے۔ حدیث میں ہے کہ تین موقعوں پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔ ایک میدانِ حج میں جب ننگے سر، ننگے پاؤں، بال بکھرے ہوئے، ناخن بڑھے ہوئے، نہ خشبو اور نہ زینت، اور ''لبیک! لبیک!'' کہتے ہوئے بندے پھر رہے ہیں، حق تعالیٰ کو اس موقع پر ہنسی آتی ہے کہ کیا چیز ان کے گھروں سے نکال کر لائی ہے؟ بیوی بچے چھوڑے، وطن چھوڑا، آخر یہ کیوں فقیروں کی طرح بے وطن ہوئے ہیں؟ میری محبت میں ہی تو پھر رہے ہیں۔ حق تعالیٰ ہنستے ہیں اور ملائکہ سے کہتے ہیں کہ تمہیں گواہ کرتا ہوں، میں نے ان سب کی مغفرت کی، یہ میری محبت میں گھر بار، بیوی بچوں کو چھوڑ کر آئے ہیں، میں کریم ہوں، یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ گھر بار چھوڑیں اور میں توجہ نہ کروں، میں نے ان سب کی مغفرت کی۔ تو خوش ہوکر مغفرت فرماتے ہیں، اس خوشی کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا۔

دُوسرا موقع..... جب مکبّر تکبیر کہے اور لوگ دوڑ دوڑ کر آرہے ہیں کہ صفِ اُولیٰ میں جگہ ملے، ہر ایک کہتا ہے مجھے ملے، گویا ایک قسم کا جھگڑا ہے اور آگے پیچھے ہونے کی دوڑ ہے۔ حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ جو اپنا گھر چھوڑ کر میرے گھر میں آئے ہیں، ان میں سے ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے، یہاں کوئی مٹھائی روٹی نہیں مل رہی؟ یہ آخر کیوں دوڑ رہے ہیں؟ یہ میری محبت میں دوڑ رہے ہیں، یہ ہمارا دربار جان کر آئے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے جتنا بھی قریب ہوجائیں گے اتنے ہی ہمارے درجات بلند ہوں گے۔ اس سے خوش ہوکر اللہ تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے۔

تیسرا موقع..... یہ ہے جب خاوند اور بیوی پڑے ہوئے سو رہے ہیں، اچانک خاوند کی آنکھ کھلی اور جی چاہا کہ تہجد پڑھوں، اس نے بیوی کے منہ کے اُوپر پانی کا چھینٹا مارا، وہ ہڑبڑا کر اُٹھی، اس نے کہا: کیا مصیبت آئی ہے؟ خاوند نے کہا: دو رکعت نفل پڑھ لے، تہجد کا وقت ہے۔ حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ یہ اس کی محبوبہ ہے، اس کے پاس لیٹی ہوئی ہے، آرام سے میٹھی نیند سو رہی تھی، ایک دم گھبرا کے اُٹھی کہ بارش تو نہیں آگئی، خاوند نے کہا: بارش تو نہیں، مگر دو

رکعت پڑھ لے۔ تو یہ آگے سے کہتی ہے کہ میں شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مجھے دو رکعت پڑھنے کی توفیق ہوگئی۔ اس نے بھی کھڑے ہو کے دو رکعتیں پڑھیں۔ یا بیوی نے خاوند کے منہ پر چھینٹا مار دیا اور وہ ہڑبڑا کے اُٹھا، تو یہ موقع بھی حق تعالیٰ کی ہنسی کا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ تینوں چیزیں درجات کے بلند ہونے کا باعث ہیں اور اللہ تعالیٰ کی انتہائی رضا کا وقت ہے، اس واسطے اس کو ہنسی سے تعبیر کیا گیا۔ تو یہ جو فرمایا گیا کہ: ''وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا'' کہ جب رات تنہائی میں گزارتے ہیں تو کبھی سجدہ و رُکوع میں اور کبھی تلاوت میں ہیں، اس پر حق تعالیٰ کو ہنسی آتی ہے کہ کوئی دیکھنے والا نہیں، کسی کو یوں نہیں کہہ سکتے کہ دیکھو! میں بڑا عابد و زاہد ہوں، کسی کو دِکھلانے کے لئے یہ نہیں اُٹھا صرف میری رضا کے لئے اُٹھا ہے، کیونکہ میں کریم ہوں، میں بخشتا ہوں اور مغفرت کرتا ہوں۔

اب گویا تین باتیں ہوئیں، اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (خطباتِ حکیم الاسلام)

پانچ چیزوں کی تلاش..... حضرت شیخ بلخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: میں نے پانچ چیزیں تلاش کیں تو وہ مجھے پانچ چیزوں میں مل گئیں:

① ..... رزق میں برکت تلاش کی تو وہ مجھے چاشت کی نماز میں ملی۔

② ..... قبر میں روشنی تلاش کی تو وہ مجھے تہجد کی نماز میں ملی۔

③ ..... قبر میں منکر نکیر کے سوالوں کے جوابات مجھے تلاوتِ قرآن سے ملے۔

④ ..... پل صراط سے آسانی سے گزرنا مجھے صدقہ اور روزے میں ملا۔

⑤ ..... قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عرش کا سایہ مجھے خلوت (تنہائی) میں ذکر سے ملا۔

انسان جانوروں سے بھی سیکھتا ہے..... انسان سیکھنا چاہے تو جانوروں سے بھی سیکھ سکتا ہے، اس کی ایک مثال فقہاء کا وہ تبصرہ ہے جو انہوں نے ''فہد'' نامی شکاری جانور پر کیا ہے۔ (اس لفظ کا ترجمہ بعض لوگ ''چیتے'' سے کرتے ہیں جو ٹھیک نہیں، چیتا انسانی تربیت کو قبول نہیں کرتا، اس لفظ کا صحیح معنی ''تیندوا'' ہے، یہ بلی اور چیتے کے درمیان کی چیز ہے، اس جانور کو شکار کے لئے سدھایا جاتا ہے اور یہ درندوں میں اتنا ہی زبردست شکاری ہے جتنا

''باز'' پرندوں میں)۔فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ یہ جانور ایسی اعلیٰ فطری خصوصیات کا حامل ہے جن کو انسان بھی اپنائیں تو ان کے کردار میں بہترین اوصاف پیدا ہو جائیں۔فقہِ حنفی کی شہرۂ آفاق کتاب ''ردّ المحتار'' المعروف بہ ''فتاویٰ شامیہ'' کی کتاب الصید میں سے ایک پیراگراف کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''شمس الائمہ سرخسی رحمہ اللہ اپنے اُستاذ شمس الائمہ حلوانی رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہیں کہ ''تیندوے'' میں کچھ ایسی خصلتیں ہیں جو عقل مند آدمی کو اپنانی چاہئیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ شکار پر جھپٹنے کے لئے گھات لگا کر چھپ جاتا ہے اور اپنے آپ کو اس پر ظاہر نہیں ہونے دیتا۔عقل مند شخص کو چاہئے کہ اگر کوئی اس کا دُشمن ہو جائے تو یہ اس کی مخالفت میں اپنی جان ہلکان نہ کرے بلکہ اس کے دفع شر کے لئے مناسب موقع کی تلاش میں رہے اور اپنے آپ کو تھکائے بغیر دُشمن سے نجات حاصل کرے۔اس جانور کی ایک صفت یہ ہے کہ اس کو دورانِ تربیت اگر کسی غلطی پر سزا دی جائے تو یہ سیکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔اس کو سکھانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ کتا جب ویسی ہی غلطی کرے تو اس کے سامنے اسے سزا دی جاتی ہے،تب یہ بھی وہ حرکت چھوڑ دیتا ہے۔عقل مند لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ دُوسروں سے عبرت پکڑتے ہیں،جیسا کہ عرب کی مشہور کہاوت ہے:''**السعید من وعظ لغیرہٖ**'' نیک بخت آدمی وہ ہے جس کو کسی دُوسرے کے ذریعے نصیحت حاصل ہو اور خود اس پر مصیبت آنے سے پہلے دُوسروں پر آئی آفت سے وہ اپنی اصلاح کرلے۔اس جانور کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ یہ گندا گوشت نہیں کھاتا، بلکہ اپنے مالک سے اچھے اور صاف گوشت کی توقع رکھتا ہے،صاحب عقل شخص کو چاہئے کہ ایسی چیز کو منہ نہ لگائے جس کو اس کے رَبّ نے اس پر حرام قرار دیا ہے۔ایک عادت اس کی یہ بھی ہے کہ یہ ایک شکار پر زیادہ سے زیادہ تین یا پانچ مرتبہ حملہ کرتا ہے،اگر پھر بھی وہ اس کے ہاتھ نہ آئے تو یہ اس کا پیچھا نہیں کرتا اور اپنی جان کو بلاوجہ خطرے میں نہیں ڈالتا۔'' (ردّ المحتار، کتاب الصید، ج:۶،ص:۴۶۷)

جنات کہاں دفن ہوتے ہیں؟...... جنات پر جب موت آتی ہے تو ان کے وجود کہاں

دفن کئے جاتے ہیں؟ اس سلسلے میں خاتم المحدثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ صدر مدرّس دارالعلوم دیوبند کے ملفوظات میں منقول ہے کہ جنات فضا میں دفن ہوتے ہیں۔ (خیر الفتاویٰ، ج:۳،ص:۲۲۲)

باتیں بڑوں کی.....

- .....دولت اس کی نہیں ہوتی جو حاصل کرتا ہے، بلکہ اس کی ہوتی ہے جو سلیقے سے خرچ کرتا ہے۔
- ..... مصیبتیں سچی خوشی کا پیش خیمہ ہیں، اس لئے خندہ پیشانی اور صبر وشکر سے برداشت کرو۔
- .....انصاف بُرائیوں کو روکتا ہے۔
- ..... جو لوگ غصّے کو برداشت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے دِل کو نورِ ایمان سے بھر دیتے ہیں۔
- .....عقل مند بیٹھ کر اپنی تکالیف کا رونا نہیں روتا، بلکہ اپنی تکالیف کے تدارک میں بخوشی کوشاں رہتا ہے۔
- ..... بیٹا وہی ہے جو ماں باپ کا خدمت گزار ہو۔ دوست وہی ہے جس پر یقین ہو اور بُرے وقت کام آئے۔
- ..... جب پروانہ شمع کو دیکھ لیتا ہے پھر واپس تاریکی میں نہیں جاتا، چیونٹی بھی مٹھائی کے ڈھیر پر مرجاتی ہے، لیکن اس کو چھوڑتی نہیں، اسی طرح نیک عابد خوشی سے سب کچھ چھوڑنا گوارا کرتا ہے لیکن خداوند کریم کی محبت سے منحرف نہیں ہوتا، اس کی فرماں برداری میں لگا رہتا ہے۔
- .....اگر تم چاہتے ہو کہ سب لوگ تم سے محبت کریں تو تم بھی سب سے محبت کرو، تمہاری آرزو پوری ہوگی، تم دیکھتے ہو جو چنا بوتا ہے وہ چنا ہی کاٹتا ہے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ تم محبت کرو اور تم سے دُشمنی کی جائے؟ بشرطیکہ کوئی خاص مطلب اور خودغرضی نہ ہو۔
- ..... بنی ہوئی راہ پر چلنے والے سب ہی ہوتے ہیں، لیکن دُوسروں کے لئے راہ صاف

بنانے والے بہت کم ہوتے ہیں۔

ایمانی مزاج کب بیمار ہوتا ہے؟..... جب تم یہ محسوس کرو کہ تمہاری عقل فانی چیزوں کی باقی رہنے والی اشیاء پر ترجیح دیتی ہے تو یہ سمجھ لو کہ عقلی توازن برقرار نہیں، اور جب تمہارے دِل سے حبِ اِلٰہی اور خدا سے ملنے کی تمنا رُخصت ہو جائے اور اس کے بجائے مخلوق اور دُنیا کی محبت گھر کر لے تو جان لو کہ تمہارے دِل کی موت واقع ہوگئی ہے، اور جب تمہاری آنکھ خدا کے خوف میں ایک قطرہ آنسو گرانے سے بھی انکار کر دے تو سمجھ لو کہ قساوتِ قلبی کی انتہا ہے، اور جب تمہارا نفس خدا کی یاد سے گھبرانے اور دُنیا اور دُنیا والوں کی باتوں میں دِلچسپی لینے لگے تو یہ جان لو کہ اب تمہارا اور اس کا راستہ الگ ہو چکا ہے، کیونکہ یہ علامتیں اس بات ثبوت ہیں کہ ایمانی مزاج بیمار ہے اور خواہشات کی نبض تیز ہے۔ (اِمام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ)

اللہ کے راستے میں تکلیف..... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے راستے میں مجھے اِتنا ڈرایا دھمکایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ڈرایا گیا، اور اللہ کے راستے میں مجھے اتنا ستایا گیا کہ کسی اور کو اتنا نہیں ستایا گیا، اور ایک دفعہ تیس دن رات مجھ پر اس حال میں گزرے کہ میرے اور بلال رضی اللہ عنہ کے لئے کھانے کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو کوئی جاندار کھا سکے، بجز اس کے جو بلال رضی اللہ عنہ نے اپنی بغل میں دبا رکھا تھا۔ (جامع ترمذی)

نماز سے غافل کرنے والی چیزیں..... حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا ذکر کیا اور فرمایا: جو اس کی حفاظت کرے گا اس کے لئے وہ نور اور حجت ہوگی اور قیامت کے دن نجات کا ذریعہ، اور جو اس کی حفاظت نہ کرے اس کے لئے وہ نہ نور ہوگی اور نہ دلیل اور نہ ہی نجات کا ذریعہ، اور اس کا حشر قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور اُبی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔ (احمد طبرانی وابن ماجہ)

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: آدمی کو نماز سے غافل کرنے والی چیزیں چار ہیں، مال و دولت، حکومت، منصب اور تجارت۔ جس

شخص کو مال نے مشغول کر دیا اور اس مال کی وجہ سے نماز چھوڑ دی تو وہ قارون کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔ اور جس کو حکومت نے مشغول کر دیا اس کی وجہ سے وہ نماز سے غافل ہو گیا تو وہ فرعون کے ساتھ اُٹھایا جائے گا، اور جس کو منصب اور عہدہ مشغول کر دے وہ ہامان کے ساتھ اُٹھایا جائے گا، اور جس کو تجارت مشغول کر دے وہ منافقین کے سردار اُبی بن خلف کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔

نفع کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں؟..... شریعتِ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ عبادت کی بنیاد نفع وضرر پر ہے، مگر وہ نفع وضرر جو مالک کے قبضے میں ہو، تو دُنیا میں جتنے بھی اسباب ہیں نفع ونقصان ان کے قبضے میں نہیں ہے، یہ مالک کے ارادے سے نفع ونقصان پہنچاتے ہیں، خود ہتھوڑا نفع ونقصان نہیں پہنچاتا، خود ہوا نفع نہیں پہنچاتی، مشیتِ خداوندی نفع پہنچاتی ہے۔ اصل میں نفع کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، جو مسبّب الاسباب ہے، اسباب کے ہاتھ میں نفع ونقصان پہنچانا نہیں ہے، اس لئے عبادت اس کی ہی کی جائے گی جس کے قبضے میں نفع ونقصان ہے، نہ اس کی جو نفع ونقصان کا صرف سبب ہے، نفع ونقصان کا موجد نہیں ہے، نفع ونقصان کا خالق نہیں ہے، محض سبب بنتا ہے، تو سبب بن جانے سے موجد یا خالق بننا لازم نہیں ہوتا۔ (از حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ)

مدینہ والوں میں سب سے بہترین آدمی..... حضرت معاویہ بن حرمل رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: اے امیر المؤمنین! آپ کے لشکر کے قابو پانے سے پہلے ہی میں نے توبہ کر لی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم کون ہو؟ میں نے کہا: مسیلمہ کذاب کا داماد معاویہ بن حرمل ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جاؤ! اور جو مدینہ والوں میں سب سے بہترین آدمی ہے اس کے مہمان بن جاؤ۔ میں حضرت تمیم داریؓ کا مہمان بن گیا، ایک دفعہ مدینہ کے پتھریلے میدان میں آگ نکل آئی، اس وقت ہم لوگ باتیں کر رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر تمیم رضی اللہ عنہ سے کہا (چلو اور اس آگ کا انتظام کرو)، حضرت تمیم رضی اللہ عنہ نے کہا: میری کیا حیثیت؟ اور کیا

آپ اس بات سے نہیں ڈرتے کہ میرے پوشیدہ عیوب آپ پر ظاہر ہوں۔ اس طرح حضرت تمیم رضی اللہ عنہ کسفر نفسی کر رہے تھے، (لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصرار فرمایا تو) حضرت تمیم رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور آگ کو دھکے دیتے رہے، یہاں تک کہ جس دروازے سے نکلی تھی اسی میں واپس کر دیا، اور پھر خود بھی آگ کے پیچھے اس دروازے کے اندر چلے گئے، پھر باہر آ گئے اور اس سب کے باوجود آگ انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکی۔ اور ابو نعیم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت تمیم رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ان ہی جیسے کاموں کے لئے ہم نے تمہیں چھپا رکھا ہے اے ابو رقیہ! (یہ حضرت تمیم رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔)

حضرت ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ..... حضرت ابو یزید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: میں نے تیس سال مجاہدات کئے، مگر مجھے کوئی مجاہدہ علم اور اتباعِ علم سے زیادہ شدید نہیں معلوم ہوا، اور اگر علماء کا اختلاف نہ ہوتا تو میں مصیبت میں پڑ جاتا، بلاشبہ علماء کا اختلاف رحمت ہے (مگر وہ اختلاف جو تجربہ توحید میں ہو کہ وہ رحمت نہیں) اور اِتباع صرف اِتباعِ سنت کا نام ہے (کیونکہ علمِ سنت کے علاوہ دُوسری چیز علم کہلانے کی مستحق نہیں)۔

ایک مرتبہ ایک بزرگ ان کے وطن میں تشریف لائے، شہر میں ان کی ولایت و بزرگی کا چرچا ہوا، حضرت ابو یزید نے بھی زیارت کا قصد کیا اور اپنے ایک رفیق سے کہا کہ: چلو! ان بزرگ کی زیارت کر آئیں۔

ابو یزید رحمہ اللہ اپنے رفیق کے ساتھ ان کے مکان پر تشریف لے گئے، یہ بزرگ گھر سے نماز کے لئے نکلے، جب مسجد میں داخل ہوئے تو جانبِ قبلہ تھوک دیا، ابو یزید رحمہ اللہ یہ حالت دیکھتے ہی واپس آ گئے اور ان کو سلام بھی نہ کیا، اور فرمایا کہ: یہ شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب میں سے ایک ادب پر مامون نہیں کہ اس کو ادا کر سکے، اس لئے کیا توقع رکھی جائے کہ کوئی ولی اللہ ہو۔

امام شاطبی رحمہ اللہ اس واقعے کو کتاب الاعتصام میں نقل فرمانے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

حضرت ابو یزید کا یہ ارشاد ایک اصلِ عظیم ہے، جس سے معلوم ہوا کہ تارکِ سنت کو درجۂ ولایت حاصل نہیں ہوتا، اگر چہ ترکِ سنت بوجہ ناواقفیت ہونے کے ہوا ہو۔

اب آپ اندازہ کریں کہ جو علانیہ ترکِ سنت اور اِحداث و بدعت پر مصر ہو، ان کو بزرگی اور ولایت سے دُور کا بھی کوئی واسطہ ہوسکتا ہے؟

انسان کیا ہے؟.....اصلی اور بنیادی حقیقت یہ ہے کہ انسان کیا ہے اور انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسان کس طرح زندگی گزار سکتا ہے؟ اس معاملے میں یورپین قومیں بالکل مفلس ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ تمام فتوحات بچوں کا کھیل ہو کر رہ گئی ہیں، مغربی تہذیب ایک ڈرامہ کھیل رہی ہے، جیسے کہ شیکسپیئر کے ڈرامے ہوتے تھے، ہم اور آپ تماشائی ہیں، دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ واہ واہ! کیا ہوا میں اُڑے اور کیا پانی پر چلے! لیکن ہوا کیا؟ انسان نے کتنی ترقی کی؟ انسانیت نے کتنی ترقی کی؟ دُنیا میں امن کتنا پھیلا؟ محبت و بھائی چارہ کتنا عام ہوا؟ ایک دُوسرے سے کتنا قریب ہوا؟ انسان نے انسان کو کتنا پہچانا؟ دِل کتنے روشن ہوئے؟ قلب کو سکون کتنا حاصل ہوا؟ انسان کو اپنی منزل کا کتنا پتا چلا؟ انسان کے اخلاق دُرست ہوئے یا نہیں؟ اس کے اندر خراب اخلاق تھے، دُوسرے کو پھاڑنا، اپنے بچوں کو پالنا، دُوسرے گھروں کو لوٹ کر اپنا گھر بھرنا، دُوسروں کی جیب کاٹ کر اپنی جیب بھرنا، دُوسروں کو ذلیل اور غلام بنا کر خوش ہونا اور اپنی فتح کے جھنڈے اُڑانا، اس میں کتنی کمی آئی؟ ان قوموں نے اس دُنیا کو منڈی سمجھ لیا ہے، یا اقبالؔ کے الفاظ میں ایک قمار خانہ سمجھ لیا ہے اور اس کے نتیجے میں دو جنگیں... پہلی اور دُوسری جنگِ عظیم ہوئیں۔ میں پوچھتا ہوں آخر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ ان ساری فتوحات سے انسانیت کو کیا حاصل ہوا؟ میں بالکل حقیقت پسند اور عملی آدمی کی طرح آپ سے پوچھتا ہوں کہ اس سے انسانیت نے اپنا اصلی سفر کتنا طے کیا اور دُنیا کو کیا امن و سکون حاصل ہوا؟ اور انسان نے اپنے حقیقی مقصد میں کتنی کامیابی حاصل کی؟ آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ قوموں کی باہمی عداوتیں کم نہیں ہوئیں، بلکہ ایسی شدید ناانصافیاں ہو رہی ہیں جسے کہتے ہیں ہاتھ نکل جانا۔

بچوں کی تعلیم و تربیت.....اسلام میں بچوں کی تعلیم و تربیت اور تأدیب کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: تم اپنے بچوں کو سب سے پہلے ''لا اِلٰہ اِلاَّ اللہ'' سکھاؤ، اور موت کے وقت بھی ''لا اِلٰہ اِلاَّ اللہ'' کی تلقین کرو۔ حضرات صحابہ و تابعین کا پسندیدہ معمول تھا کہ جب بچہ بولنے لگتا تھا تو اس کو سات بار ''لا اِلٰہ اِلاَّ اللہ'' پڑھاتے تھے، اور سات سے دس سال کی عمر تک بچوں کو قرآن اور دُعا وغیرہ کی اتنی تعلیم دے دیا کرتے تھے کہ وہ اس عمر میں باقاعدہ نماز ادا کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا تھا کہ: تم سات سال کے بچوں کو نماز کا حکم دو، اور دس سال کے بچوں کو نماز نہ پڑھنے پر تنبیہی مار مارو۔ عہدِ رسالت تک بچوں کی تعلیم کے لئے علیحدہ اور مستقل مکتب نہیں تھا، بلکہ صحابہ اپنے اپنے گھروں میں بچوں، بچیوں کو قرآن اور دِین کی ضروری باتوں کی تعلیم دیتے تھے۔ عرب کے مختلف قبائل سے آنے والے وفود کے ساتھ بچے بھی رہا کرتے تھے، اور بڑوں سے زیادہ شوق اور رغبت کے ساتھ خدمتِ نبوی میں آکر قرآن اور دِین کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

موجودہ دور اور نجات.....موجودہ دورِ انحطاط میں مسلمانوں کی پستی کو بلندی میں تبدیل کرنے کے لئے فتنوں کے سدِ باب کے لئے، دُشمنوں کو زیر کرنے کے لئے اور سب سے بڑھ کر مغرب کے استحصالی حربوں سے بچنے کے لئے کسی نئے نظریے یا تہذیب کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کے لئے مسلمانوں میں اللہ کی طرف انابت اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے اِتباعِ کامل کی ضرورت ہے۔ تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ مسلمان جب تک ان صفات کے حامل رہے ہیں، غلبہ اور حکومت انہی کی تھی اور جب انہوں نے ان خوبیوں کو چھوڑا تو مغلوبیت اور محکومیت کا شکار ہوتے چلے گئے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان باوجود کثرتِ وسائل کے دُنیا کے کسی خطے میں بھی عزت و تمکن کے ساتھ نہیں رہ رہے ہیں۔ آیئے! صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ادوار کو دیکھیں کہ کس طرح مسلمان بامِ عروج تک پہنچے، انہوں نے اپنے ہی نظریے، تمدن اور اخلاق سے دُشمنوں کو زیر کیا تھا، مسلمانوں کے عروج کی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان جب تک ''اِنْ تَنْصُرُوا اللہَ'' ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے'' پر

عمل پیرار ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ ''یَنْصُرْکُمْ'' ''تو وہ تمہاری مدد کرے گا'' کے مطابق ان کے ساتھ عمل کیا، اور جب تک مسلمان:

''کی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے وفا تو نے ہم تیرے ہیں''

کی تصویر بنے رہے، تو بحر و بَر پر ان کے اقتدار کا پرچم لہراتا رہا۔ آج بھی مسلمانوں کی ترقی و عروج کا راستہ دُوسروں کی نقالی میں نہیں، اسلام سے مخلصانہ وابستگی میں ہے، اپنے ظاہر و باطن کو تعلیماتِ اسلام کے رنگ میں رنگنا اور مؤمن کامل بننا فلاح کا یقینی ذریعہ ہیاور ''وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ'' کا ربانی اعلان قیامت تک کے لئے دعوتِ عمل ہے۔

جہاد اور لڑائی میں فرق..... اسلامی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ جہاں عہد کی خلاف ورزی کا شبہ بھی ہو گیا تو سارا مفتوحہ علاقہ واپس کر دیا۔ اس کی ایک مثال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ ہے، کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رُوم کی حکومت سے جنگ بندی کا معاہدہ کر لیا، ابھی جنگ بندی کے معاہدے کی میعاد ختم نہیں ہوئی تھی کہ اس دوران حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ اس مدت کے اندر اپنی فوجیں رُومیوں کی سرحد پر ڈال دیں اور حملے کے لئے تیار ہو گئے، اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی تاریخ پوری ہوئی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کو حملے کا حکم دیا، دُشمن اس کے لئے تیار نہ تھا، اس لئے مسلمانوں کے لشکر کو ہر طرف سے فتح مل رہی تھی اور یہ لشکر فتوحات کرتا ہوا جا رہا تھا، اچانک دیکھا کہ پیچھے سے ایک گھڑ سوار دوڑا آ رہا ہے، جب سوار قریب آیا تو اس نے بلند آواز سے کہنا شروع کیا: ''**قفوا عباد اللہ! قفوا عباد اللہ!**'' ''اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ! اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ!'' جب وہ سوار قریب آیا تو دیکھا کہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ: کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ: ''**وفاءً لا غدر، وفاءً لا غدر**'' ''مؤمن کا شیوہ وفاداری ہے، غداری نہیں'' حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی! اس پر حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خود یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: ''جس کا کسی قوم کے ساتھ

معاہدہ ہوتو وہ اس کی معینہ مدت تک نہ تو اسے توڑے اور نہ اس میں تبدیلی کرے، جب تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان کردے کہ ہم نے وہ معاہدہ ختم کردیا، لہٰذا مدت گزرنے سے پہلے یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کئے بغیر ان کی سرحد پر لے جاکر فوجیوں کو ڈال دینا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لئے جائز نہیں تھا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا تو حکم دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے وہ سب واپس کردو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کردیا اور اپنی سرحد میں واپس آگئے۔'' (ترمذی ابواب السیر، باب ماجاء فی الغدر، حدیث:۱۶۲۹)

اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاد اور عام لڑائیوں میں کتنا زبردست فرق ہے...!

مختصر جملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سوانح عمری..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ میں کسی نو وارد نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ دریافت کی تو آپ نے اس ایک مختصر جملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سوانح عمری بیان فرمادی کہ: ''کان خلقه القرآن'' یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت، جبلت، خصلت وہی تھی جو قرآن ہے، گویا دریا کوزے میں بند کردیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دُنیا کی تمام کتبِ سیر ایک طرف اور اُمّ المؤمنینؓ کا یہ جملہ ایک طرف۔ چنانچہ اگر ان دونوں میں موازنہ کیا جائے تو سیرت کی کتبِ مطوّلات میں بھی وہ بات نہ ملے گی جو اُمّ المؤمنینؓ نے اس مختصر جملے میں حقِ سیرت ادا کیا ہے، اس بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرتِ طیبہ تک اس وقت تک رسائی نہیں ہوسکتی جب تک قرآن مجید کی گہرائی تک نہ پہنچا جائے اور یہ ایسی بات ہے جس پر چودہ سو برس گزرنے پر بھی پوری رسائی نہ ہوسکی، چنانچہ کسی نے اپنے اس شعر میں اسی نکتے کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

جمیع العالم فی القرآن لٰکن ۔ تقاصر عنه افهام الرجال

یعنی قرآن میں تو تمام علوم ہیں، مگر فہمِ انسانی وہاں تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر

بلیغ اور موثر تقریر..... حضرت شاہ اسماعیل صاحب قدس سرہٗ کے مواعظ کے واقعات تو بہت کثرت سے ہیں، اوران مواعظ کی تاثیر کی وجہ سے غنڈے ان کے بہت ہی مخالف ہو گئے تھے، حتیٰ کہ ہر وقت لوگ ان کے قتل کے درپے رہتے تھے، اس لئے خاندان کے لوگ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی حفاظت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عشاء کی نماز کے بعد جامع مسجد دہلی سے اس دروازے کو چل دیئے جو قلعے کی طرف کھلتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے لپک کر ان کو پکڑا اور پوچھا کہ: کہاں جاتے ہو؟ میں اس وقت تنہا نہ جانے دُوں گا، اگر تم کہیں جاؤ گے میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ: میں خاص ضرورت سے جارہا ہوں، تم مجھے جانے دو اور میرے ساتھ نہ آؤ۔ میں نے اصرار کیا مگر وہ نہ مانے اور تنہا چل دیئے۔ میں بھی ذرا فاصلے سے ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ خانم کے بازار میں ایک بڑی مال دار اور مشہور رنڈی کا مکان تھا اور اس کا نام موتی تھا، مولاناؒ اس کے مکان پر پہنچے اور آواز دی، تھوڑی دیر میں مکان سے ایک لڑکی نکلی اور پوچھا کہ: تم کون ہو اور کیا کام ہے؟ انہوں نے کہا کہ: میں فقیر ہوں! وہ لونڈی یہ سن کر چلی گئی اور جا کر کہہ دیا کہ ایک فقیر کھڑا ہے۔ رنڈی نے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ جا کر دیدے۔ وہ لڑکی پیسے لے کر آئی اور مولانا کو دینا چاہا، میں نے کہا کہ: میں ایک صدا کہا کرتا ہوں اور بغیر صدا کہے لینا میری عادت نہیں، تم اپنی بی بی سے کہو کہ میری صدا سن لے۔ اس نے جا کر کہہ دیا، رنڈی نے کہا کہ: اچھا بلا لے! وہ بلا کر لے گئی، مولانا جا کر صحن میں رُومال بچھا کر بیٹھ گئے اور آپ نے سورۂ والتین "ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْن" تک پڑھی، میں بھی وہاں پہنچ گیا اور جا کر مولانا کے پیچھے کھڑا ہو گیا، اور مولانا نے اس قدر بلیغ اور موثر تقریر فرمائی کہ گویا جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرادیا، اس رنڈی کے یہاں بہت سی اور رنڈیاں بھی تھیں اور ان کے علاوہ اور لوگ بھی بہت تھے، ان پر اس کا یہ اثر ہوا کہ سب لوگ چیخ چیخ کر رونے لگے اور کہرام مچ گیا، اور انہوں نے ڈھولک، ستار وغیرہ توڑنے شروع کیے اور موتی اور اس کے علاوہ کئی رنڈیاں تائب ہو گئیں۔ (ارواح، ص:۶۹)

زبان کی آفتیں زبان کی آفتیں بہت سی ہیں، مثلاً فضول باتیں کرنا، خلاف شرع

باتیں کرنا، ناحق بحث ومباحثہ کرنا، لڑائی کرنا، باتوں میں بناوٹ اور تکلف کرنا، گالی گلوچ کرنا، کسی کا راز ظاہر کرنا، جھوٹا وعدہ کرنا، جھوٹ بولنا، جھوٹی قسم کھانا، جھوٹی گواہی دینا، غیبت کرنا، چغل خوری کرنا، کسی کی زیادہ تعریف وخوشامد کرنا، خدا کی ذات وصفات میں محض اٹکل پچو گفتگو کرنا، علماء سے فضول باتیں پوچھنا۔

اس کا علاج یہ ہے کہ جو بات کہنی ہو، پہلے تأمل کرلے اور سوچ لے کہ اس بات سے اللہ تعالیٰ جو سمیع وبصیر ہیں ناخوش تو نہ ہوں گے؟ اس عمل کے بعد اِن شاء اللہ تعالیٰ کوئی بات گناہ کی منہ سے نہ نکلے گی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عادت..... حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا دستور العمل تھا کہ آپ اکثر اپنے ہاتھ سے سودا خرید کر بازار سے لایا کرتے تھے۔ آپ کی عادت تھی کہ ترازو کے دونوں پلڑوں میں ہر چیز کو وزن کرا لیتے تھے۔ ایک روز ایک سبزی فروش عورت سے سبزی خرید کر ترازو کے دونوں پلڑوں میں وزن کرایا۔ سبزی فروش عورت نے بطور اعتراض کے عرض کیا کہ: آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا کہ: تیرا حق میری جانب اور میرا حق تیری جانب نہ آجائے، میں تجھ کو پاک کرتا ہوں اور خود بھی پاک رہتا ہوں، کیونکہ دُوسرے کا حق عالم بقا میں بڑی خرابی پیدا کرتا ہے۔ وہ عورت قدم بوس ہوئی اور آئندہ احتیاط رکھنے لگی۔

زندگی کا اُلٹا رُخ..... ایک مولوی صورت آدمی ایکسپریس ٹرین کے فرسٹ کلاس میں داخل ہوا، اس کے سوا کیبن میں تین اور مسافر تھے اور تینوں پورے معنوں میں ''مسٹر'' تھے، مذکورہ مسافر کے سادہ لباس اور اس کے چہرے کی شرعی داڑھی نے اس کو اس ماحول میں اجنبی بنا دیا۔ کئی اسٹیشن گزر گئے، تینوں مسٹر آپس میں باتیں کرتے رہے، مگر کسی نے مولوی کی طرف رُخ نہیں کیا۔ مولوی شاید ان کے نزدیک اس قابل نہ تھا کہ اس سے بات کی جائے۔ آخر مولوی نے یہ کیا کہ اگلے اسٹیشن پر ایک انگریزی اخبار خریدا اور اس کو ہاتھ میں لے کر اُلٹی طرف سے دیکھنے لگا۔ مسٹر صاحبان یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑے، ایک شخص نے دُوسرے سے انگریزی میں کہا: اس مولوی کو دیکھو! اُلٹی طرف سے اخبار پڑھ رہا ہے، دُوسرا بولا: یہ شخص جب

انگریزی نہیں جانتا تو اس کو خواہ مخواہ انگریزی اخبار خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟

مسٹر صاحبان کو یقین تھا کہ مولوی ان کی گفتگو کو سمجھ نہیں رہا ہے، ان کو معلوم نہ تھا کہ ''مولوی'' ان سے زیادہ انگریزی جانتا ہے، اس کے بعد مولوی ان کی طرف مخاطب ہوا اور انگریزی زبان میں مسلسل بولنا شروع کیا، اس نے انگریزی میں کہا: کیا یہ کوئی قانونی جرم ہے کہ اخبار کو اُلٹی طرف سے پکڑا جائے؟ آخر آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں انگریزی زبان نہیں جانتا۔ اس کے بعد اس نے گفتگو کو دُوسری طرف موڑ دیا، اس نے کہا: ایک اخبار کو اُلٹی طرف سے پکڑنا آپ کو کتنا عجیب معلوم ہوا، مگر معاف کیجئے! آپ اور آپ جیسے بے شمار لوگ پوری زندگی کو اُلٹی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔

زندگی کو غیر مادّی مقصد کی طرف سے پکڑنا چاہئے اور لوگ اس کو جسم کی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔ زندگی کو دیکھنے کا صحیح رُخ یہ ہے کہ اس کو آخرت کی طرف سے دیکھا جائے، مگر لوگ اس کو دُنیا کی طرف سے دیکھ رہے ہیں، ہمارا سب سے اہم مسئلہ موت ہے، مگر تمام لوگ زندگی کو سب سے اہم مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ خدا کی نظر سے انسان کو دیکھا جائے، مگر آج سارے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ انسان کی نظر سے خدا کو دیکھ رہے ہیں۔

اخبار کا اُلٹا رُخ ہر ایک کو دِکھائی دے رہا ہے، اور زندگی کا اُلٹا رُخ کسی کو نظر نہیں آتا، کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنے آپ کو دیکھنے والا سمجھتے ہیں مگر ان کو وہی چیز دِکھائی نہیں دیتی جس کو انہیں سب سے زیادہ دیکھنا چاہئے۔

نعمت کے آثار دُوسروں کو نظر آئیں..... ایک روز اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنی مجلس میں ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے بہت بوسیدہ اور پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں، اِمام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص سے کہا: ''یہ جائے نماز اُٹھاؤ، اور اس کے نیچے جو کچھ رکھا ہو لے لو۔''

اس شخص نے جائے نماز کو اُٹھایا تو دیکھا کہ: ایک ہزار درہم رکھے ہوئے ہیں، امام

ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''یہ درہم لے جاؤ، اور اس سے اپنی حالت دُرست کرلو۔'' اب وہ شخص بولا: ''میں تو مال دار آدمی ہوں، اللہ نے مجھے بہت سی نعمتیں دی ہیں، مجھے ان دراہم کی ضرورت نہیں۔'' اِمام صاحبؒ نے فرمایا: ''کیا تم نے وہ حدیث نہیں سنی کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے پر اللہ کی نعمتوں کے آثار دُوسروں کو نظر آئیں؟ تمہیں چاہئے تھا کہ اپنی حالت ٹھیک کرتے تاکہ دیکھ کر تمہارا کوئی دوست مغموم نہ ہو۔''

عورت کی سب سے بڑی خوبی..... ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت فرمایا کہ: بتاؤ! عورت کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کا جواب نہ بن پڑا، سوچنے لگے، حضرت علی رضی اللہ عنہ چپکے سے اُٹھ کر گھر گئے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سوال ذکر کیا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے برجستہ فرمایا: تم لوگوں نے یہ جواب کیوں نہ دیا کہ عورت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مرد اس کو نہ دیکھیں اور نہ وہ غیر مردوں کو دیکھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جا کر یہ جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسم کی خدمت میں عرض کردیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ جواب کس نے دیا ہے؟ حضرت علیؓ نے عرض کیا: فاطمہ نے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہ ہو، فاطمہ آخر میرے جگر کا ٹکڑا ہے!

رُوح کے چار مکان

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ رُوح کے چار مکان ہیں، اور ان چاروں مکانوں میں اس کا گزر ہوتا ہے۔

پہلا مکان: ماں کا شکم ہے، یہ مکان نہایت تنگ قید خانہ ہے اور سخت اندھیرا ہے۔

دُوسرا مکان: دُنیا ہے جس میں پیدا ہوا اور اچھے بُرے کام کئے۔

تیسرا مکان: عالم برزخ ہے، یعنی موت کے بعد سے قیامت تک، یہ مکان دُنیا سے بہت زیادہ بڑا ہے، جس طرح دُنیا، ماں کے شکم سے بڑی ہے۔

چوتھا مکان: جس کے بعد کوئی دُوسرا مکان نہیں ہے، آخرت ہے، یعنی جنت یا جہنم۔

محبتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.....ایک دفعہ کفر و اسلام کی جنگ کے موقع پر ایک عورت شمع نبوّت کی حفاظت کے لئے مدینہ منورہ سے نکلتی ہے، اسے اپنے باپ کی شہادت کی خبر ملتی ہے، پھر بھائی کی، شوہر کی، وہ یہ تینوں جگر خراش خبریں بے پروائی سے سنتی ہے اور آگے بڑھ جاتی ہے، جب سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کو دیکھ پاتی ہے تو بے اختیار پکار اُٹھتی ہے اگر تو موجود ہے تو ہر ایک مصیبت آسان ہے۔ (حکایاتِ صحابہ رضی اللہ عنہم)

اللہ کے خوف سے نکلنے والے آنسوؤں کی برکت.....حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ کے خوف اور ہیبت سے جس بندۂ مؤمن کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکلیں، اگرچہ وہ مقدار میں بہت کم، جیسے مکھی کے سر برابر (یعنی ایک قطرہ ہی کے بقدر) ہوں، پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر پہنچ جائیں، تو اللہ تعالیٰ اس چہرے کو آتشِ دوزخ کے لئے حرام کر دے گا۔ (سنن ابن ماجہ)

سب سے قریب راستہ.....میں نے علم کلام کے سارے مباحث اور فلسفے کے تمام ابواب پر پوری طرح غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سے نہ بیمار تندرست ہوتا ہے اور نہ پیاسا سیراب! میں نے پایا کہ منزلِ مقصود تک لے جانا والا سب سے قریب راستہ قرآن پاک کا ہے۔ (امام رازی رحمۃ اللہ علیہ)

صحت مند رہنے کے لئے عبادت خانے جایئے.....جان ہاپکنس یونیورسٹی (JOHN HOPKINS UNIVERSITY) امریکا کے ڈاکٹر جارج ڈبلیو، کام سٹاک (Dr. George W. Comstock) نے جو تحقیقات کی ہیں، ان سے ایک بڑی دِلچسپ بات کا انکشاف ہوا ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ عبادت خانے جاتے ہیں ان میں امراض کم ہوتے ہیں۔

مذہب کا صحت پر اثر پڑتا ہے، لیکن ڈاکٹر موصوف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مرض کے سلسلے میں عبادت خانے جانے سے کوئی خطرہ تو نہیں؟

یہ بات تو ظاہر ہو چکی ہے کہ جو لوگ عبادت گاہ نہیں جاتے، ان کے جگر زیادہ خراب

ہو جاتے ہیں، اسی طرح ان میں سگریٹ نوشی کی وجہ سے پھیپڑوں کے امراض زیادہ ہو جاتے ہیں، بہر حال جب یہ دیکھا گیا کہ عبادت خانے جانے والی خواتین جن کی عمریں پینتالیس سے لے کر چونسٹھ سال تک تھیں، دِل کے امراض میں مقابلتاً کم مبتلا ہوتی ہیں، تو پھر مزید دِلچسپ انکشافات کے امکانات روشن ہو گئے۔

کیا یہ نیکی کا صلہ سمجھا جائے یا کسی گروہ سے وابستگی کی وجہ سے ہے، کیا عبادت خانے جانے والوں کی شخصیت دُوسری قسم کی ہوتی ہے یا یہ تناؤ میں کمی ہو جانے اور سکونِ قلب حاصل ہو جانے سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے اموات کا بھی موازنہ کیا، انہوں نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو ہفتے میں کم از کم ایک یا ایک سے زیادہ عبادت خانے جاتے تھے اور ان کو بھی دیکھا جو اس سے بھی کم جاتے تھے، تو دیکھنے میں یہ آیا کہ جو لوگ عبادت خانے زیادہ جاتے تھے ان کی موت جگر کی خرابیاں یا پھیپڑوں اور دِل کی خرابی سے کم ہوئی۔

اس کے برعکس جو لوگ عبادت خانے بہت کم جاتے تھے وہ لوگ اس قسم کے امراض میں مبتلا ہو کر مر گئے۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ ابھی کسی حتمی فیصلے پر پہنچنا بہت مشکل ہے، لیکن انہیں اُمید ہے کہ مذہبی رُجحان سے صحت پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اس کے بارے میں لوگوں کی دِلچسپی میں اضافہ ہو جائے گا۔

ظالم ابھی ہے فرصت توبہ، نہ دیر کر
وہ بھی گرا نہیں جو گرا پھر سنبھل گیا

آج کل سائنس (Science) اور ٹیکنالوجی (Technology) کے اس دور میں اغیار کی طرح ہمارا مسلم معاشرہ بھی اخلاقی زبوں حالی میں بری طرح مبتلا ہے، ہر طرف بے حیائی، گناہ، ظلم، فساد اور منکرات کا دور دورہ ہے، اسلامی تعلیمات اور آخرت سے غفلت عام ہے۔

اس بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح کیلئے جہاں ایک طرف وعظ و نصیحت، دعوت و تبلیغ، درس قرآن و حدیث، تعلیم و تدریس اور وقتاً فوقتاً مجالس خیر کے انعقاد کی ضرورت ہے وہاں اس بات کی بھی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ تحریری میدان میں آکر صدق دل اور اخلاص کے ساتھ جہاد بالقلم کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کیا جائے۔

الحمدللہ! کمپیوٹر کے اس پرفتن دور میں روحانی، دینی اور اخلاقی مضامین پر مشتمل بہت ساری مفید کتابیں مارکیٹ میں آرہی ہیں۔ اس وقت ''علمی موتی'' کے نام سے جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ دوران مطالعہ جہاں کوئی علمی، اصلاحی بات یا کوئی سبق آموز واقعہ احقر کے دل کو لگا اسے اپنے پاس محفوظ کرلیا اور اب مرتب کرکے اس کو کتابی شکل دی جارہی ہے، اگر اس سے قارئین کو کوئی فائدہ ملا تو یہ ''نور علی نور'' ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اس چھوٹی سی محنت کو شرف قبولیت سے نوازے اور اس کو قارئین کیلئے نفع بخش بنائے۔ (آمین)

دعاؤں کا محتاج

زر محمد عفرلہ

خادم تدریس جامع فاروقیہ کراچی